JUNE
2021

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض لاہور

Stay Home
Stay Safe

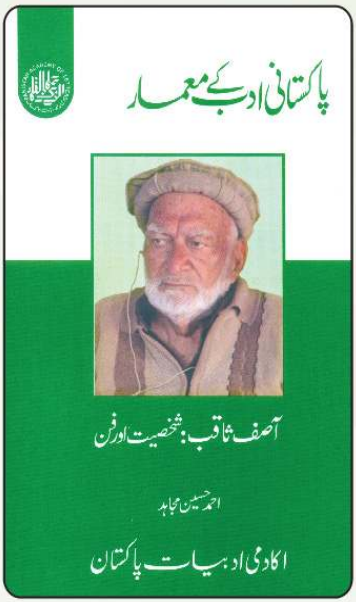

لکھی کو کون موڑے؟
بشریٰ رحمٰن

پاکستانی ادب کے معمار
آصف ثاقب : شخصیت اور فن
احمد حسین مجاہد
اکادمی ادبیات پاکستان

نمی دانم
شکیل جاذب

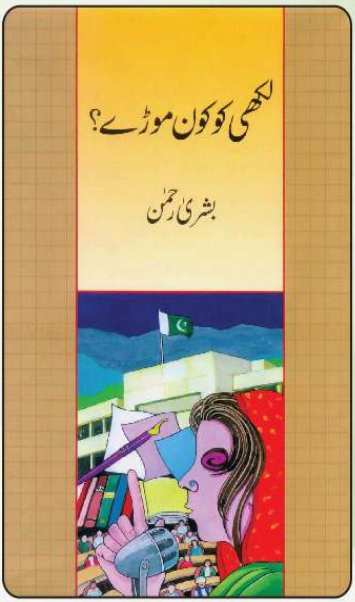

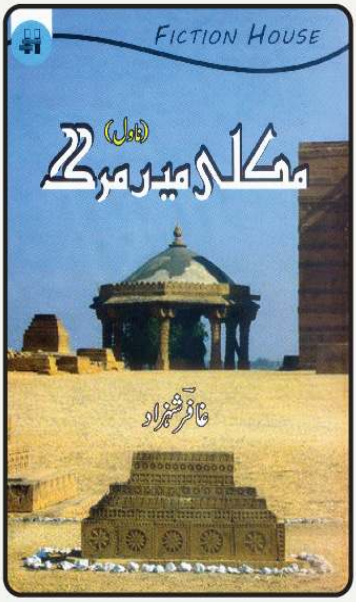

FICTION HOUSE
(ناول)
مکلی میں مرگ
غافر شہزاد

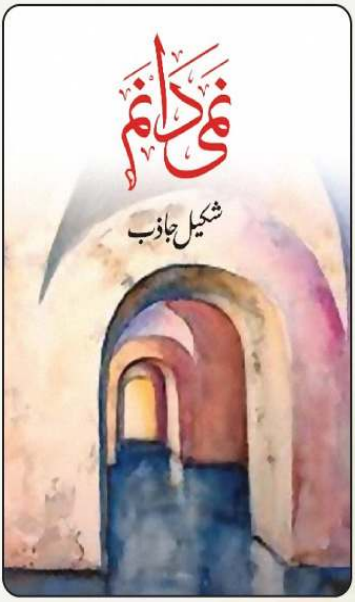

غزل

زخم بھر جائیں گے، دن گزر جائیں گے، عمر کی طرح ڈھلتے رہو
رات ڈھل جائے گی، رُت بدل جائے گی، وقت کے ساتھ چلتے رہو

راستی کے دیئو راستی سے جلو، نُور کے پیڑ ہو، نور دو
تم پہ اک قرض ہے، تم پہ اک فرض ہے شاخ در شاخ پھلتے رہو

ایک دن آئے گا، پول کھل جائے گا، انتظار اُس گھڑی کا کرو
ہر ستم ٹال دو، ہر سپر ڈال دو، اور وعدوں پہ ٹلتے رہو

معبدوں سے ورے، گنبدوں سے پرے، زور کی ایک آواز دو
خواہشوں کے لیے، بارشوں کے لیے بیج برسات جلتے رہو

گردشیں تم سے ہیں، بندشیں تم سے ہیں، تم سے جو ہو سکے وہ کرو
تم تو حالات ہو، تم ہی دن رات ہو، تم بھی چھپتے نکلتے رہو

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شارح

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - جون 2021 - شمارہ نمبر: 6

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com   www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	نسیم سحر، خاور اعجاز	7 تا 8
2	نعت	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، عقیل رحمانی احمد جلیل، حامد یزدانی، سرور حسین نقشبندی، افتخار شاہد محسن رضا شافی، محمد علی ایاز	9 تا 18
3	عقیدت	محمد انیس انصاری، احسان علی حیدر، اسد رضا سحر	19 تا 21
4	ہائیکو	ریاض ندیم نیازی، خاور اعجاز	22 تا 23
5	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	24 تا 28
6	شاعرِ امروز	ظہور منہاس، عادل گوہر [شاہد ماکلی]	29 تا 34
7	افسانے	بلقیس ریاض، حبیب الرحمٰن، گل زیب عباسی اقبال خان یوسف زئی، انعام الحسن کاشمیری، تہنیت رباب محمد علی، شکیل احمد خاں، امین کنجاہی، عائشہ احمد جاوید، محمد شفیق	35 تا 92
8	مائیکرو فکشن	سلمان یوسف سمیجہ	93 تا 94
9	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، جمیل یوسف انور شعور، راحت سرحدی، خاور اعجاز، اکرم ناصر، محمد انیس انصاری	95 تا 152

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	گلزار بخاری، اسلام عظمی، سید مقبول حسین، شاہنواز زیدی حامد یزدانی، حمیرا راحت، سید قاسم جلال، شوکت محمود شوکت قمر رضا شہزاد، افتخار شاہد، ریاض رومانی، آفتاب خان ریاض ندیم نیازی، ارشد محمود ارشد، انصر حسن، نبیل قیصر احمد جلیل، حسنین سحر، شہزاد احمد شیخ، حکیم خان حکیم، ظہور چوہان نعیم رضا بھٹی، اکرم جاذب، محمد نوید مرزا، رخشندہ نوید سید فرخ رضا ترمذی، ناہید عزمی، ارشد شاہین، رفعت وحید تاثیر نقوی، صغیر احمد صغیر، امر جیکی، وسیم جبران، عزم الحسنین عزمی احمد سجاد بابر، ساجد رضا خان، عالمگیر براج، احمد محمود رمیض نقوی، عاصم اعجاز، عدنان خالد، تائل راٹھور، عنبرین خان تاثیر جعفری، ایم یٰسین آرزو، عمار یاسر مگسی، طارق جاوید ملک منتظر بانس، شہاب اللہ شہاب، روبینہ ممتاز روبی آیت آفرین، محمد حماد، اسد رضا سحر، کنور امتیاز احمد	95 تا 152
10	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	153 تا 162
11	مضامین	سلمیٰ اعوان، عافر شہزاد، کبیر اطہر، اعجاز روشن، سیما پیروز محمد نوید مرزا، انعام الحسن کاشمیری، ارشد محمود ارشد محمد شعیب مرزا، محمد جمیل اختر، خالق آرزو	163 تا 203
12	طنز و مزاح	محمد ہمایوں خان	204 تا 207
13	نظمیں	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، سید انصر ساجد، گلزار بخاری، راحت سرحدی کرامت بخاری، خاور اعجاز، حامد یزدانی، حمیرا راحت، تسنیم کوثر، زبیر فاروق شوکت محمود شوکت، امین کنجاہی، امجد بابر، اظہر عباس فیصل ہاشمی، رخسانہ سحر، راجہ عبدالقیوم، کاظم حسین، رخشندہ نوید	208 تا 230
14	خطوط	منزہ نقوی، آصف ثاقب، بشریٰ رحمٰن، جمیل یوسف، ملک غلام مصطفیٰ تبسم رانا محمد شاہد، آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، محمد انیس انصاری	231 تا 241

حمد

''ہر شعبۂ حیات میں امکانِ حمد ہے''
اِدراک کب کسی کو ہے، کیا شانِ حمد ہے!

ابجد کے سب حروف میں دیوانِ حمد ہے
تاباں ہر ایک حرف میں عنوانِ حمد ہے

ہر پھول ہے خدا کی خدائی کا معترف
ہر سُو کِھلا ہوا چمنستانِ حمد ہے

ہر حرف اس کی ذات کے شایانِ شان ہو
یوں جان لیجیے کہ یہی شانِ حمد ہے

حمد اور نعت دونوں میں کچھ فرق ہے کہاں؟
ایوانِ نعت اصل میں ایوانِ حمد ہے

آگے ذرا چلیں جو دبستانِ نعت سے
مُلحق اُسی کے ساتھ دبستانِ حمد ہے

یہ رمز ہر کسی پہ تو کھلتی نہیں نسیم
احساس کچھ انوکھا سا دورانِ حمد ہے

نسیمِ سحر

حمد

خزاں کے دور میں فصلِ بہار دیتا ہے
یقیں کی حد کو گماں سے اُسار دیتا ہے

ہری توقع سے پہلے ہی بات بنتی ہے
وہ میرے کام اچانک سنوار دیتا ہے

طلوع کرتا ہے اُس پر پھر اِک نیا سورج
وہ جس کسی کو شبِ انتظار دیتا ہے

یونہی عطا نہیں کرتا کوئی عملداری
وہ ظرف دیتا ہے ، پھر اختیار دیتا ہے

جہاں اِک آدھ غمِ زندگی کسی کو مِلا
وہاں وہ سُکھ بھی اُسے بے شمار دیتا ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ارحم راحم ، رحمت کا چھینٹا
تو ہی مالک ہے ، سیدھے رستوں کا

نعتؐ

خدا کی ہر عنایت سے مدینے کا خیال آئے
محمدؐ کی محبت سے مدینے کا خیال آئے

رسولؐ پاک نے رستہ دکھایا ہم کو وحدت کا
ہمیں پیغامِ وحدت سے مدینے کا خیال آئے

اُدھر کا رُخ کریں گے ہم وفا کی پائیداری سے
ارادت سے مسافت سے مدینے کا خیال آئے

ارادے کے قرینے میں دعا کی اُستواری ہے
خدا کردہ مشیّت سے مدینے کا خیال آئے

بڑے احسان سے بخشی خدا نے عشق کی عزّت
عطا کردہ عقیدت سے مدینے کا خیال آئے

نبیؐ کا شہر یادوں میں بسا رکھیں گے ہم ہر دم
غموں اشکوں کی نسبت سے مدینے کا خیال آئے

روانی وقت کی نعت نبیؐ کے شعر لکھوائے
گزرنے والی ساعت سے مدینے کا خیال آئے

وہیں سے مشکلیں پردیسیوں کی دور ہوں ثاقبؔ
ہمیں احساسِ غربت سے مدینے کا خیال آئے

آصف ثاقب

نعتؐ

"کُن" کے لمحے کا مدّعا ہیں آپؐ
ابتدا آپ ، انتہا ہیں آپؐ

کم نصیبوں کے ہم نفس ، دلدار
بے وسیلوں کا آسرا ہیں آپؐ

ہر زمانے پہ آپؐ کا سایا
ہر زمانے سے ماورا ہیں آپؐ

کسی طوفاں کا ڈر نہیں مجھ کو
میری کشتی کے ناخدا ہیں آپؐ

شبِ تیرہ میں نُور کا رستہ
بے یقینی میں حوصلہ ہیں آپؐ

کامیابی کا ، خیر و برکت کا
تا ابد ایک سلسلہ ہیں آپؐ

جس نے ہر چیز کو بدل ڈالا
ایسا قدرت کا فیصلہ ہیں آپؐ

ایک اُمّی پہ ہو عیاں ہر عِلم
کوئی دیکھے تو معجزہ ہیں آپؐ

مالکِ کُل کی ، ربِ قادر کی
چلتی پھرتی ہوئی رضا ہیں آپؐ

جس کا جو حق ہے وہ اُسی کا ہو
اس تصوّر کے پیشوا ہیں آپؐ

جس نے رشتوں کو آبرو بخشی
اُس مواخات کی بِنا ہیں آپؐ

جو بھی اور جس قدر مسافر ہیں
سب کی منزل کا راستہ ہیں آپؐ

سدرۃ المنتہیٰ کے منظر کے
ایک ، بس ایک آشنا ، ہیں آپؐ

دشمنوں کے لیے معافی کی
آخری حد سے بھی سِوا ہیں آپؐ

پیشِ منظر ہو یا کہ پس منظر
ہر دو عالم کا رابطہ ہیں آپؐ

صرف اک قوم کے نہیں امجدؔ
ساری خلقت کے رہنما ہیں آپؐ

امجد اسلام امجد

نعتؐ

تیریؐ سیرت سے جسے پیار نہیں ہو سکتا
وہ کبھی صاحبِ کردار نہیں ہو سکتا

جبر زادوں کی پزیرائی انا کے آگے
تیراؐ دیوانہ نگوں سار نہیں ہو سکتا

جس کے دل میں ہوں فروزاں تریؐ راہوں کے چراغ
چڑھتے سورج کا پرستار نہیں ہو سکتا

جو تریؐ رو میں نکلتے ہیں، کبھی ان کے لیے
کوئی غم راہ کی دیوار نہیں ہو سکتا

تیرےؐ سرچشمۂ حکمت سے کیا جس نے گریز
عمر بھر واقفِ اسرار نہیں ہو سکتا

جس کے سینے میں سجا گفتۂ فیصل تیراؐ
صیدِ بے سمتیِ افکار نہیں ہو سکتا

جس کی جھولی میں ہو دولت تری چاہت والی
زرِ دنیا کا طلبگار نہیں ہو سکتا

جس نے بھی کھینچ لیا دائرۂ وردِ درود
کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہو سکتا

کارِ ہستی میں تریؐ یاد سے غافل ہو جائے
دل کبھی اتنا گنہگار نہیں ہو سکتا

جلیل عالی

نعتؐ

دل میں چراغ نور جلا کر لکھی ہے نعتؐ
پھر حق کی روشنی میں نہا کر لکھی ہے نعت

پہنچا خیال طور پہ ، یاد آ گئے حضورؐ
دو نُور میں نے دل میں بسا کر لکھی ہے نعت

مجھ کو یقیں ہے پہنچے گی باب قبول تک
روضے کی سمت ہاتھ اُٹھا کر لکھی ہے نعت

اللہ کو عزیز ہے ، آقاؐ کو بھی پسند
عشقِ رسولؐ دل میں سجا کر لکھی ہے نعت

حرفوں میں بھی سجائی ہیں روضے کی جالیاں
لفظوں کو آفتاب بنا کر لکھی ہے نعت

اپنی سیاہ کاریاں جب یاد آ گئیں
آنکھوں سے اپنے اشک بہا کر لکھی ہے نعت

ہم کو سکونِ قلب ہوا اس لیے نصیب
آقاؐ کو دل کا درد سنا کر لکھی ہے نعت

وہ صرف ہو گی پیش مواجہ شریف میں
جو کاتبین سے بھی چھپا کر لکھی ہے نعت

بخشش کا صرف ہو گی وسیلہ وہی عقیلؔ
جو روضۂ رسول پہ جا کر لکھی ہے نعت

عقیل رحمانی

نعتؐ

جب بھی الہام نعتؐ ہوتی ہے
روبرو اُنؐ کی ذات ہوتی ہے

باوضو لفظ لفظ ہوتا ہے
با ادب بات بات ہوتی ہے

جب بکھرتے ہیں گیت مدحت کے
وجد میں کائنات ہوتی ہے

کملیؐ والے کی رحمتوں کے طفیل
عاصیوں کی نجات ہوتی ہے

اُنؐ کی سوچوں میں دن گزرتا ہے
اُنؐ کی یادوں میں رات ہوتی ہے

کب میں تنہا جلیل ہوتا ہوں
یاد آقاؐ کی ساتھ ہوتی ہے

جس کی جانب جلیلؔ ہوں آقاؐ
اُس کی تو کائنات ہوتی ہے

احمد جلیل

نعتؐ

بسا کر شوق اِس دل میں ترے در کی زیارت کا
ترا حامدؔ ہے پھر سے منتظر تیری اجازت کا

اگر مقدور ہو، پڑھتا رہوں میں رات دن قرآں
کروں آئینۂ سیرت میں بھی دیدار صورت کا

یہ سارے باغ، یہ ساری بہاریں کیا کریں لے کر
ہمیں تو پھول اک کافی ہے بس تیری شفاعت کا

ازل سے ہی مری قسمت میں تھی تیری ثنا خوانی
ہے میرے فن کو بھی اعزاز حاصل تیری بیعت کا

حقیقت یہ ہے میرے پاس اپنا کچھ نہیں آقاؐ
ثنا کرنے کو بھی چاہوں اشارہ تیری رحمت کا

وہ ہوں حسانؓ یا پھر کعبؓ یا ابنِ رواحہؓ ہوں
ادا کس سے ہوا حق، کس سے ہوگا تیری مدحت کا

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آقاؐ، اے آقاؐ، اے آقاؐ، مجھ پر ہاتھ دھریں
آپؐ کا قرب نہ جانے کیا ہو؟ آپ کی یاد بہار

نعتؐ

زمیں پہ خلد کے آثار دیکھ آئے ہیں
خوشا کہ روضۂ سرکار دیکھ آئے ہیں

بجا ہے ان کی تڑپ بھی جو طیبہ جا نہ سکے
وہ کیا کریں کہ جو اک بار دیکھ آئے ہیں؟

قدم قدم پہ کھلے ہیں جہاں کرم کے گلاب
محبتوں کا وہ گلزار دیکھ آئے ہیں

جہاں سے نعمتیں بٹتی ہیں دو جہانوں کو
عطا کا نقطۂ پرکار دیکھ آئے ہیں

ہر ایک ذرہ جہاں تابشوں کا مظہر ہے
خدا کے حسن کا شہکار دیکھ آئے ہیں

بلائیں لیتا ہوں سرورؔ میں اُن کی آنکھوں کی
مرے نبی کا جو دربار دیکھ آئے ہیں

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپؐ کے ہاتھ قبول کریں تو کنکر بول اُٹھیں
آپؐ کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے یہ شعری اظہار

نعتؐ

میں یہاں ہوں گماں مدینے میں
جسم ڈسکہ ہے جاں مدینے میں

کیا گھڑی تھی کہ جس گھڑی پہنچا
آپ کا کارواں مدینے میں

آپ کے گھر سے متصل ہوتا
کاش ہوتا مکاں مدینے میں

بن کے منگتے غرور کرتے ہیں
بادشہ بھی یہاں مدینے میں

یاد آئی بلالِ حبشی کی
جب بھی گونجی اذاں مدینے میں

رنگوں نسلوں کے ٹوٹ جاتے ہیں
سارے فخر و گماں مدینے میں

خاک میں مل کے خاک ہو شاہدؔ
یہ مرا خاکداں مدینے میں

افتخار شاہد

نعتؐ

عرش تک معراج کا جب سلسلہ دیکھا گیا
شش جہت میں جا بجا اک نور سا دیکھا گیا

ایک دن خیرالنساء کے گھر اکٹھے جو ہوئے
انما کا ترجمہ زیرِ کساء دیکھا گیا

کھول کر قرآن کو جب بھی پڑھا جس جا سے بھی
آپ ہی کی رفعتوں کا تذکرہ دیکھا گیا

اور حبیبِ کبریاؐ کی ذات سے بڑھ کر کوئی
عالمیں میں کون کامل رہنما دیکھا گیا

کنزِ مخفی جو ازل سے پردۂ غیبت میں تھا
مصطفیٰؐ میں منعکس جلوہ نما دیکھا گیا

وہ اویسِ قرن ہوں یا ہو کوئی مجھ سا غلام
ان کی رحمت میں بھلا کب فاصلہ دیکھا گیا

محسن رضا شافی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ہر نعمت کا مالک ، وہ نعمتوں کے قاسم
کاش مجھے دونوں ٹھہرا لیں رحمت کا حقدار

نعتؐ

اللہ کی رحمت کے خزینے سے جڑا ہے
جو شخص محمدؐ کے مدینے سے جڑا ہے

ہر پھول مہکتے ہوئے دیتا ہے گواہی
خوشبو کا سفر ان کے پسینے سے جڑا ہے

توصیفِ محمدؐ میں ہیں الفاظ یوں اترے
ہر لفظ کسی خاص قرینے سے جڑا ہے

ہر شخص ہی حیران ہے نسبت میری سن کر
منجدھار میں ہے، پھر بھی سفینے سے جڑا ہے

ہر شخص کو ملتی ہے اسی شہر سے خیرات
اک سلسلہء خیر مدینے سے جڑا ہے

کھل جاتا ہے میلاد کا آتے ہی نظر چاند
دل سرور عالم کے مہینے سے جڑا ہے

محمد علی ایاز

اے حبیبِ خدا، مرحبا، مرحبا!

اے حبیبِ خدا ، مرحبا ، مرحبا! نعمتِ کبریاؑ ، مرحبا ، مرحبا !

حسنِ تخلیق تمؐ ، حرفِ تصدیق تمؐ کون ہے آپؐ سا ، مرحبا ، مرحبا !

حدِ ادراک سے ماورا ، ماورا آپ کا مرتبہ ، مرحبا ، مرحبا !

ہر زمانہ پکارے گا تا بہ ابد مصطفیٰؐ ، مجتبیٰؐ ، مرحبا ، مرحبا !

آج بھی گم ہیں خوشبوئے انفاس میں غارِ ثور و حرا ، مرحبا ، مرحبا !

جس نے درشن کیا اور کلمہ پڑھا وہ صحابیؓ ہوا ، مرحبا ، مرحبا !

تا قیامت حدیثِ مبارک ہے وہ آپؐ نے جو کہا ، مرحبا ، مرحبا !

بندگی بھی مری ، زندگی بھی مری صدقۂ مصطفیٰؐ ، مرحبا ، مرحبا !

حج و عمرہ ، بلاوا ہے سرکارؐ کا اُن کا مہماں کدہ ، مرحبا ، مرحبا !

روزِ محشر شفاعت پہ موقوف ہے آخری فیصلہ ، مرحبا ، مرحبا !

اے اینسِ دل و جاں فِدا آپ پہ یہ غلام آپ کا ، مرحبا ، مرحبا !

محمد انیس انصاری

عقیدت

احسان علی حیدر

حمد ہے اس کے لئے جس نے اُتاری حمد ہے
آلِ احمدؐ اصل میں ساری کی ساری حمد ہے

ایک ہے ابن مظاہر ایک ہے حُرِ جری
اک نزولی نعت ہے اک اختیاری حمد ہے

جس نمازی کو خدا کہنے لگی فہمِ بشر
اس ولیِ عصر کی سجدہ گزاری حمد ہے

زیرِ خنجر وہ پکارا قل ھو اللہُ احد
غیب سے آواز آئی یہ ہماری حمد ہے

پشتِ ناقہ پر بھی اَلحمدُ لِاَھلِ لکھ دیا
دخترِ خیرالوریٰ کی شہ سواری حمد ہے

قبر میں دو نور چمکے اور ملک کہنے لگے
یہ تمہاری نعت ہے اور یہ تمہاری حمد ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا پر سایہ ، رحمت نے ڈالا
دن سا پیغمبرؐ ، سانچے میں ڈالا

عقیدت

وحدت سے جب نکالے خیالات نعت کے
اوصاف پھر بیاں ہوئے آقا کی ذات کے

خلوت میں رو کے میں نے پکارا تھا یا نبی
سو فائدے ہوئے تھے اُسی ایک بات کے

معلوم ہو گیا تھا یہ معراج کی ہی شب
ہوتے ہیں کتنے لمحے کسی ایک رات کے

کرب و بلا کے ساتھ زیارت حضور کی
مقصد ہی صرف دو تھے ہماری حیات کے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا ایک ہمارے پیروں کی زنجیر ہوئی
لوگ دلوں پر پاؤں دھرتے کر گئے دنیا پار

نعتیہ ہائیکو

نعتیں لکھتا ہوں
میں تو پیار کے لہجے میں
ان کا شیدا ہوں

سنّی کی شامیں
مجھ سے کرتی ہیں اکثر
آقا کی باتیں

وہ ہیں رب کے ندیم
رب نے اُنؐ کی مرضی سے
کی ہے ہر ترمیم

جیون گھٹتا جائے
نعت لکھوں، بے چینی کا
بادل چھٹتا جائے

خواب میں جب وہ آئیں
پاکیزہ سی خوش بو سے
سانسیں مہکی جائیں

اُن کو یاد کروں
سنّی میں بھی رہ کر میں
دل کو شاد کروں

ریاض ندیم نیازی

ہائیکو

چپ ہے دروازہ
گھر کے اندر برپا ہے
تنہائی کا شور

دیواریں خاموش
گونج رہی ہے مندر میں
دھڑکن کی آواز

جلتی ہے اِک آگ
کوئی بُلاتا ہے شاید
دریا کے اُس پار

ٹوٹے کیونکر آس
ایک ستارہ بیٹھا ہے
دل کھڑکی کے پاس

آئینے میں زنگ
باقی عمر گذاریں گے
حیرانی کے سنگ

آنکھیں خالی ہیں
شاید اس کی یادیں بھی
بجھنے والی ہیں

خاور اعجاز

رت جگے

گہری میٹھی نیند رب کائنات کی ایسی خوبصورت عطا ہے جو انسان کے جسم و جاں کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ مکمل بھی کرتی ہے۔ رت جگے میٹھی نیند کا بدل تو نہیں ہو سکتے مگر سوچوں کے نئے در وا کر دیتے ہیں نیند سے کوئی فکری انبساط تو نہیں ملتا مگر رات ہو تنہائی ہو پھر ندرت خیال ہو۔ تخیل کی بلند پروازی اسی پرسکون لمحے کی منتظر ہوتی ہے باہر تاریکی اندر روشنی ہو باہر ہو کا عالم ہو دل میں باتوں کا ریلا یادوں کا میلہ ہو باہر خاموشی ہو دل باتیں کرے باہر کوئی ہلچل نہ ہو دل میں کیف و سرور کا اک جہاں آباد ہو۔ رت جگے اس لیے بھی حسین لگتے ہیں کہ

* یہ آپ کا موقف سنتے ہیں۔
* آپ سے متفق ہوتے ہیں آپ سے AGREE کرتے ہیں۔
* دنیا داری میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی دوست سے عزیز سے احباب سے یا کسی پیارے سے بات کریں تو دوسری جانب سے اعتراض ہوتا ہے دلائل کا اک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے مگر تنہائی خاموشی خود کلامی یا اپنے پیارے خالق و مالک سے سرگوشی اک ایسے نادیدہ جہاں میں لے جاتی ہے۔ جہاں کوئی معترض ہوتا ہی نہیں دنیاوی تعلقات میں کوئی نہ کوئی بحث چھڑ جاتی ہے یہاں کسی مباحثے یا معاذ اللہ مناظرے کا گزر ہی نہیں بس پیار ہی پیار ہے تعلق ہی تعلق ہے قرب ہی قرب ہے شناسائی ہی شناسائی ہے آپس کی بات ہے اور بات ہی ایک ہے یہاں کوئی اکتاہٹ نہیں الحمد اللہ کوئی بے مروتی نہیں اک افسانوی سا ماحول اپنے اندر دنیا کی سب سے بڑی حقیقت لیے اپنی نرم گرم اور گداز ساعتیں لیے استقبال کو کھڑی ہوتی ہے۔

رت جگوں کا خمار بستر کی ہر شکن کی زبانی سنا بھی جا سکتا ہے دیکھا بھی جا سکتا ہے یہ کیسی حسین چیز ہے جس سے صرف رات کو جاگنے والا ہی لذت حاصل کر سکتا ہے حتی کہ گھر والوں کو بھی اس کا پتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ شریک حیات جس سے آپ کا کچھ بھی چھپا ہوا نہیں اسے بھی اس خمار کی ان باتوں کی ہوا تک نہیں لگتی جو کل رات دل نے کہیں جو دل نے سنیں جو دل نے عہد و پیمان باندھے اگر یہ رت جگا محبوب حقیقی کے لیے ہو تو اس میں بعض اوقات ندامت ہوتی ہے بعض اوقات محبت کا

سلیمان عبداللہ ڈار

دلداری کا تفاخر ہوتا ہے اس میں کبھی سوز و ساز رومی ہوتا ہے کبھی پیچ و تاب رازی ہوتا ہے کبھی اس میں دل بیدار ناروتی ہوتا ہے کبھی دل بیدار کراری۔ کبھی بندگی اور التجا اور کبھی محبت بھری نماز کبھی دل والے کہتے ہیں مالک سے دل کی بات کی تو:

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو

.....

وہ تو یہ بھی کہتے ہیں نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی رات بھر خراٹے لینے والے کو رہیں کہیں بھی ہوں انہیں سحر خیزی کے ذائقے کا علم ہی نہیں ہوتا۔

* تنہائی شناسائی اور رات کو اٹھنا اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ یہ لمحے جب آپ بلائیں گے اس وقت بات کریں گے بات بے بات یا ہر وقت والی بات کے علاوہ یہ گفتگو اسی وقت کریں گے جب آپ ان لمحات سے بولیں گے آپ کی رائے سے یہ کبھی اختلاف نہیں کریں گے۔

* رت جگے کبھی کسی سے بھی آپ کا گلہ شکوہ یا شکایت نہیں کریں گے آپ کی آنکھیں کوئی پڑھ لے تو علیحدہ بات کہ

آنکھوں میں خواب تھے یا برسوں کے رت جگے تھے
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

.....

یہ تنہا تنہا لمحے ایسے پیارے ہوتے ہیں کہ ان پر ہر انجمن ہر رنگینی قربان کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے کبھی غیبت کی نہ چغلی کھائی، جو بات بھی کی اس کی کانوں کان کسی خبر بھی نہ ہوئی راز راز بھی رہا۔ اگر کل رات کی راز والی بات کسی کے سامنے ہو گئی تو پھر وہ راز کہاں رہا راز کن فکاں کو عیاں ہونا ہے تو آپ کی صرف آپ کی آنکھ کے سامنے صرف اور صرف آپ کے دل کی دھڑکن کے روبرو عیاں ہو گا ورنہ صدیوں تک یہاں تک نہاں ہی رہے گا کہ وہ چرچا کرنے والی بات ہے ہی نہیں کوئی بھی جاننے والا اس کی ارزانی نہیں چاہے گا کہ یہ اس کی کمزوری بھی ہے اور یہی اسکی بے پناہ طاقت بھی دولت بھی بینک بیلنس بھی پراپرٹی بھی۔

رت جگے ہم سے نیند کے چند گھنٹے لیتے ہیں تھوڑی سی توجہ لیتے ہیں بستر کو شکن آلود کرتے ہیں صاحب جگراتے میں ہو تو اس سے آنسو اور آہیں لیتے ہیں مگر دیتے بھی تو بہت کچھ ہیں آیئے دیکھتے ہیں کیا دیتے ہیں۔

* ہاتھ میں دعاؤں کا پیالہ دیتے ہیں اگر رت جگے پاکیزہ ہوں رب کی یاد میں ہوں تو رب سے دل ہی دل میں ہم کلام کرتے ہیں بندہ بقول احمد ندیم قاسمی کہتا ہے صرف اس شوق نے پوچھی ہیں ہزاروں باتیں اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ تو قاسمی صاحب نے دنیاوی محبوب کو لکھا۔ یعنی میں تیرا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں محبوب حقیقی کا لازوال حسن ہی اصلی حسن کا معیار ہے اس کا کلام بھی کیا خوبصورت آسمانی ادب ہے بس بندہ پڑھتا جائے اور اللہ سے باتیں کرتا جائے

* رت جگے میں تو اپنائیت کے دریا بہتے ہیں جو بھی کہنا ہو اپنے مالک سے بے دھڑک کہہ دیں بس اپنا ہاتھ دست قدرت میں دے دیں جدھر وہ لے جائے چلے جائیں جو وہ پہنا دے پہن لیں جو وہ کھلائے کھا لیں جس حال میں مالک رکھے اس حال کو اسکی عطا سمجھیں یہ حال دکھ والا آزمائش والا تکلیف والا ہو تو بھی آیا اسی کی طرف سے ہے۔ تنگی ترشی کو نہ دیکھیں بھیجنے والے کی طرف دیکھیں ایسا دیکھنے والی نگاہ رت جگے ہی عطا کرتے ہیں۔

* رات کی تنہائی ہو اللہ کی یاد ہو دل میں محبتوں کے سمندر موجزن ہوں تو پھر محب کون کون سی اور کیا کیا باتیں کرتا ہوگا ان میں سے ہر بات دل کی زمین کو پانی دیتی ہے جس سے دل کی کھیتی ہری بلکہ ہری بھری ہو جاتی ہے۔

* یہ لمحے آنکھ کو نشہ دل کو خمار جاں کو سکون، روح کو سکون اور دل کو دلدار عطا کرتے ہیں خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے یا اک پنجابی کہاوت ہے کہ سونا اگر مل جائے تو پھر اس پر کڑھائی کرنا یا زیور بنانا کون سا مشکل کام ہے یوں یہ لمحے طلائی بھی ہیں نقرئی بھی ان کی سندرتا ہجر کو روشن اور وصل کو دل نشیں بناتی ہے یعنی رت جگے وہ کچھ دان کر دیتے ہیں کہ جاگنے والا سوچتا ہے ان میں تو خسارا ہے ہی نہیں۔

* رت جگے عمر کو زندگی اور زندگی کو بندگی بنا دینے کا معجزہ برپا کر سکتے ہیں۔

* یہ خوبصورت تنہا تنہا لمحے خزینے بھی ہیں دیئے بھی اور خواب گاہ میں جگمگ کرتے خواب نگینے بھی جو بھی کسی رات یہ گھات لگاتا ہے بہت کچھ پاتا ہے یہ تو اک نقب زنی ہے جس میں قربتیں اک دولت کی طرح ملتی ہیں اسی لیے بزرگ کہتے ہیں تہجد کے لیے اٹھو تو چوروں کی طرح اٹھو یعنی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو کہ چاہنے والے نے چاہت میں کیا کیا کچھ کہا کیا کیا عہد و پیمان کیے کیا کچھ لٹایا کیا کچھ لوٹ لیا۔

* جب دل میں الاؤ کے شعلے اٹھیں تو پڑاؤ ڈالنے کو بھی خاموش لمحے اپنا دامن وا کیے دل کی چاہتوں کا استقبال کریں گے اسی پڑاؤ میں محبتوں کو دوام ملے گا چاہت کی خوشبو ملے گی روپ کا منظر ملے گا ملن کی بشارت ملے گی اس طرح کہ جذبے اس راہ گزر پر آ جائیں گے جہاں در بدر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے یہ لمحے طویل ہوتے جائیں گے ان کی لذت اور خمار بڑھتا جائے گا اور بعض اوقات تو ایسا لگے گا کہ امنگیں آپ کی جھکی ہوئی جبین نیاز کے سامنے جھومر ڈال رہی ہیں اس سے بندہ خود حیران ہوتا ہے کہ گماں بھی نہیں تھا آنکھوں میں اتنا پانی ہے اور بندہ تو جانتا ہی نہیں کہ اسکے محبوب حقیقی کو یہ پانی اور سجدوں کی یہ مٹھاس کتنی پسند ہے۔

* رات کے جگراتے والے یہ لمحے جاگنے والے سے اک بات تو اکثر کہتے ہوں گے،

،، اے محبت کے راہی کل رات پھر پلٹ کر

آنا اپنے بے خواب بستر پر یا اپنے بیڈ روم کے اک کونے میں رازداری کے ساتھ بچھائے گئے جائے نماز پر پھر تمہیں اس سیاہ رات میں دن کے اجالے سے بھی زیادہ آنکھوں کو خیرہ کرنے والی محبت بھری روشنی بھی ملے گی چھاؤں بھی ملے گی سایہ دیوار بھی ملے گا خواہشوں کا پالن بھی تم مجھے رت جگا کہتے ہو میں تمہیں تمناؤں کی ایسی وادیوں میں لے چلوں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا جس طرح کا اعزاز و اکرام میں تمہارا کروں گا اندھیرے میں جو تم نے آنسوؤں کی گھٹائیں اٹھائیں اور نینا جیسے چھم چھم برسے یہ خالق و مالک کو اتنے بھلے اتنے اچھے اتنے دل نشیں لگے کہ وہ جنت تو تمہیں دان کرے گا ہی وہ تم سے اس طرح راضی ہو جائے گا کہ پھر کبھی ناراض نہیں ہوگا۔

*یہ خاموش گھڑیاں ہوں دل کی بات ہو ایسے میں خزاں کو وہاں سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی وہاں بہاریں ہی بہاریں ہونگی ایسے لگے گا ارد گرد پیار کے مرغزار بکھرے ہیں لمحوں کے یہ گجرے اس رات کو اور بھی خوبصورت لگتے ہوں گے جب ان میں آنسوؤں کے چمکدار موتی ٹانک دیئے جاتے ہونگے ذکر اذکار کے گلابوں اور دعاؤں کی چنبیلی کی مہک جب پھیلتی ہوگی تو ایسے لگتا ہوگا کہ اسکے مقابلے میں دنیا کے بہترین پرفیوم کچھ بھی نہیں بالکل رائیگاں ہیں۔

* اس شب بیداری کا وسنیک اور اڈیک (انتظار) دونوں ہی دلربا ہیں اس شب بیدار سے خالق و مالک چشم زدن میں چشم تر کو دیکھ کر صلح کر لیتا ہے کہ جس کی طرح اور اس جیسا کوئی پیار کرنے والا ہے ہی نہیں یہ خاموش لمحے اس کے دربار سے بہت کچھ دلانے کا سبب بن جاتے ہیں یہ دل کی حالت بدل دینے والی گھڑیاں ہیں نصیبوں سے ملتی ہیں اور نصیب والوں کو ملتی ہیں۔

میرا اک صاحب دل دوست سارا دن گھر میں آتے جاتے اپنے بستر کو شوق اور محبت سے دیکھ کر مسکراتا تھا۔

،،ایسا کیوں کرتے ہو ،، میں نے پوچھا تو بولا،، سوچتا ہوں اسی بستر پر رات کے پچھلے پہر آلتی پالتی مارے گھنٹوں اللہ جل شانہ کو یاد کروں گا دعائیں اور التجائیں کروں گا۔ اپنے مالک سے دل کی باتیں کروں گا اس سہانے منظر کو جو ابھی رات کو دل پر جسم و جاں پر طاری ہوگا ابھی سے انجوائے کر رہا ہوں اس کا سہانا مزا اور خمار ابھی سے دل پر چھانے لگا ہے۔

،،دل تو رات کو خوش ہوتا ہوگا دماغ کی کیا رائے ہوتی ہے؟ ،،

،،بس کبھی کبھار رات کو نیند نہ آئے بے خوابی ہو تو بستر پر بیٹھ جاتا ہوں پھر یادوں کی رنگوں کی باتوں کی برسات ہوتی ہے ضمیر کبھی کبھی

ملامت کرتا ہے کہ یہ کوئی محبت تو نہ ہوئی یعنی نیند تو آ نہیں رہی تھی اس وقت اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے اس لیے جب اور کوئی مصروفیت نہ تھی تو رب کو یاد کرنے لگے یہ کوئی تعلق تو نہ ہوا مزا تو تب تھا کہ نیند بھی زوروں کی آ رہی ہوتی مصروفیت بھی ہوتی مگر اس میں سے وقت نکال کر نیند کے جھونکوں کی مخالفت کر کے اللہ کو یاد کرتے،،

،، پھر تم دماغ کو ضمیر کو کیا جواب دیتے ہو؟،،

،، اول تو یہ سوچتا ہوں کہ یہ ابلیس کا چکر ہے پھر دماغ سے کہتا ہوں کہ چلو میں تمہاری ہی مان لیتا ہوں میں سچا محب نہ سہی پر سچا عاشق بننے کی کوشش تو کر رہا ہوں اب یہ بے خوابی کا وقت کسی لہو لعب یا بے دینی والی مجلس میں گزاروں تو اس سے اچھا نہیں کہ توبہ کر لوں کچھ ذکر اذکار کر لوں کچھ نہ کچھ ہی سہی دل کا گند صاف کر لوں،،

،، کبھی رت جگے نے تم سے کوئی بات کی؟،،

،، ہاں بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ تنہائی بولتی ہے نالوں کا خلق سے جواب آتا ہے،،

،، بس میں اکثر دل ہی دل میں اپنے محبوب حقیقی سے عرض کرتا ہوں محبتوں کو زمانے گذر گئے اب تو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے یہ فراق نہ جانے کب ختم ہو گا ایسے میں اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی آواز آتی ہے۔

آئی صدائے جبرائیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کے لیے عیش دوام ہے یہی

....

،، رت جگے اور کیا کہتے ہیں ؟ ،،

،، بس یہی کہتے ہیں زندگی میں کبھی بھی تعلق کو کمزور نہ ہونے دینا ملن کا چاہت کا اک دروازہ ضرور کھلا رکھنا،،

صاحب دل لوگوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں مجھے یاد آیا حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں میں ایک ڈکیت اور چور کو جانتا تھا وہ چوری بھی کرتا اور نماز بھی پڑھتا اس کے بعد بڑے درد سے دعا کرتا۔ میں نے اسے کئی بار سرزنش بھی کی مگر وہ کہتا

،، میں نماز اس لیے پڑھتا ہوں کہ بداعمالیوں کے اس ہجوم میں اک دروازہ رب کے تعلق والا ضرور کھلا رکھوں،،

آپؒ فرماتے ہیں کچھ عرصہ بعد میں بیت اللہ شریف کی زیارت کو گیا وہاں اک شخص چادر اوڑھے غلاف کعبہ کو پکڑ کر زار و قطار رو رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔

،، یا اللہ بس اب بہت ہو چکا میں سچی توبہ کرتا ہوں وہ اتنے درد سے روتا تھا کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے میں نے اس کی چادر اتاری تو دیکھا کہ وہ وہی ڈکیت تھا۔

رت جگے اگر کسی کو بھی نصیب ہوں اللہ والوں کے ہاں تو ایسا ہوتا ہی ہے مگر ہم جیسے عام لوگوں کے لیے بھی وہ اک دروازہ ضرور کھلا رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اختراعی اسلوب کا شاعر

شاعرِ امروز

ظہور منہاس

شاہد ماکلی

ظہور منہاس کی شاعری میں معنی اپنی مجرّد حالت میں ظہور پزیر نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے ہیولے میں ڈھل جاتا ہے جسے ہم بین السطور محسوس تو کرتے ہیں، اس کے تصوراتی خدوخال کو دیکھ تو سکتے ہیں مگر اس سے بہتر زبان میں اسے بیان نہیں کر سکتے ۔ جس زبان میں اسے ظہور منہاس نے بیان کیا ہوتا ہے ۔ ظہور منہاس کچھ بتانے سے زیادہ اس کیفیت کو ابھارتے ہیں جو ان کے شعر کا موضوع ہوتی ہے۔ زبان کا اس طرح کا تخلیقی استعمال بہت کم شاعروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ لیکن جس تخلیق کار کو یہ جوہر ودیعت ہو جائے اور وہ پنے اس جوہر سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکنے پہ قادر ہو تو ایسا شاعر ایجادی اور اختراعی اسلوب کا شاعر ہوتا ہے۔ ظہور منہاس کے ہاں اوائل عمری میں ہی اس اسلوب کے نمونے موجود ہیں۔

ظہور منہاس 15 مارچ 1996 کو مظفر آباد میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف آزاد جموں و کشمیر سے اُردو لٹریچر میں تعلیم حاصل کی۔ وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ بیدل اور اقبال کے فارسی کلام سے گہری محبت رکھتے ہیں۔

ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب:

وہ تھک گئی تھی بھیڑ میں چلتے ہوئے ظہور
اس کے بدن پہ اَن گنت آنکھوں کا بوجھ تھا

.....

اس قدر قہقہے ہیں دنیا میں
شرم آتی ہے مجھ کو روتے ہوئے

.....

میں بدلتا ہوں روز اپنا ہدف
یہ مری مستقل مزاجی ہے

خوش نما پیڑوں کے بیچوں بیچ گھر جاتا ہوا
ایک رستہ سانپ کی صورت میں بل کھاتا ہوا

ایک لڑکی مال کے اوصاف گنواتی ہوئی
ایک لڑکا آگہی کی رمز سمجھاتا ہوا

ایک مچھلی جھیل کے پانی پہ لہراتی ہوئی
اک مچھیرا مستری سے جال بنواتا ہوا

اک مسافر پر سفر میں مشکلیں آتی ہوئیں
ایک پودا صحن کے گوشے میں مرجھاتا ہوا

.....

یک دم دوڑے آنا گھر کے لوگوں کا
اک کمرے میں گولی چلنے کی آواز

سارے گاما پا دانی سے بڑھ کر ہے
گاؤں کی ندیا کے بہنے کی آواز

چڑ چڑ چڑ چڑ یعنی سبزے کی آہیں
ویرانے میں جنگل جلنے کی آواز

دھک دھک دھک دھک دھک دھک کرتا ماں کا دل
دروازے پر بچے لڑنے کی آواز

.....

گاڑی میں بھی گھر کو سوچے جاتا ہوں
گاڑی آگے اور میں پیچھے جاتا ہوں

.....

یہ جانتا ہوں فقط موت ہے مری منزل
تڑپ رہا ہوں مگر میں کہاں کہاں کے لیے

وہی تو سوچیں گے آئندگان میرے لیے
جو بات سوچتا رہتا ہوں رفتگاں کے لیے

.....

بہت دنوں سے وہ آتی تھی خالی ہاتھ یہاں
پھر ایک دن وہ مرے پاس جسم لے آئی

.....

بھیگے بدن بنے ہیں یہاں وجہ تشنگی
بارش نے سارے شہر میں خشکی بکھیر دی

.....

کھنڈر کے پاس رہوں گا، خلا میں دیکھوں گا
جمالیات سے باہر نکل کے لکھوں گا

تو رہ رہی ہے مرے دل کے بالاخانے میں
میں بازوؤں میں تجھے کس لیے دبوچوں گا

تمام شعر نکلتے ہیں قافیے سے اگر
تو قافیہ ہی غزل سے نکال پھینکوں گا

☆☆☆☆☆

تکثیری منطقوں کا سراغ آور شاعر

شاعرِ امروز

عادل گوہر

شاہد ماکلی

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں اردو غزل کے منظرنامے پر کئی نوجوان شعراء نے اپنی مستحکم آواز کی بنا پر سنجیدہ ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ عادل گوہر اس منظرنامے پر اپنے ہم عمر شاعروں میں زیادہ نمایاں اور منفرد ہے۔ عادل گوہر کی غزل گوئی کے اساسی انفراد کے پیچھے دو بڑے تشکیلی عناصر کارفرما ہیں۔ لفظیاتی اور معنوی تفاعلات اس کے اجزائے شعری میں یکجا اور یکجان ہو کر ایک ایسی جمالیاتی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں جس کی اثر پزیری کا پھیلاؤ معنی کی تجریدی سرحدوں کو چھوتا ہوا تکثیرات کے منطقوں تک چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس رچاؤ کا خلاقانہ برتاؤ ایک مستقبل گیر شاعر کے بھرپور امکانات کا سراغ بھی دیتا ہے۔ بلاشبہ عادل گوہر کی غزل تخلیقی شعور کے مابعد جدید افق سے پھوٹتی ہوئی معنوی حسیّت کا ایک روشن چہرہ ہے۔

عادل گوہر 27 اگست 1996 کو دائرہ دین پناہ (کوٹ ادو) میں پیدا ہوئے۔ 2016 سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ ذیل میں کچھ منتخب اشعار:

ہم کو وحشت نے پورا چھان لیا
کچھ برآمد نہیں ہوا ہم سے

یہ کس نے کائناتوں کو سکیڑا اس قدر عادل
مری نظروں سے اک موہوم سا ذرہ گزرتا ہے

خلا ٹٹول رہا ہوں کہ ہاتھ لگ جائے
وہ لہر جس سے عدم کا سراغ ملتا ہے

وہی کرے گا مجھے اپنے نور سے روشن
قسم اٹھاتا ہے جو ڈوبتے ستاروں کی

خیال و خواب کے پھل دار پیڑ کے نیچے
تمام عمر گزاری ہے بے ثمر ہم نے

میں نے پانی کو راستہ نہ دیا
لوگ کہنے لگے کنارہ مجھے

مزاجِ عمرِ رواں مستقل نہ کبھی
میں بوڑھا ہو گیا لیکن کبھی بڑا نہ ہوا

مرا وجود حقیقت کی پردہ داری ہے
جو مجھ تک آتے ہیں شبہات تک پہنچتے ہیں

جو ٹہنیاں برف سے ڈھکی ہیں، ڈھکی رہیں گی
یہاں سے سورج اب اور دنیا کو جا چکا ہے

ذرا منظر کو الٹ کر دیکھو
آگے کہسار نہیں کھائی ہے

زمین تنگ ہوئی اس قدر ہمارے لیے
ہمارا رابطہ بڑھنے لگا ستاروں سے

جہاں سے ہوتا ہے آغاز زندگی عادل
وہاں تک آنے میں گزری ہے زندگی میری

ہمیں خبر ہی نہیں وقت کے بہاؤ کی
ہم آنے والوں کو آئندگاں سمجھتے ہیں

جس احتیاط سے سینے پہ اس نے سر رکھا
میں جاگ جاتا مگر نیند میں نہیں تھا میں

وہ میرے حلیے کو دیکھ کر کہہ رہے تھے عادل
قدیم دنیا کا باسی فردا میں آ گیا ہے

مل کے کچھ دیر بے سوچی دنیا میں جب چاپ
بیٹھے رزمین راستے نارسائی کو لے جاتے ہیں، آپ بیٹھے رہیں

کیا ہے جب سے سفر اس میں آپ نے آقا
کہ رفتہ رفتہ سمندر جگہ بدل رہا ہے

یہ ایک رمز نہیں ہے شعوری کوشش ہے
کہ پست ہونا مری رفعتوں میں ڈھل رہا ہے

خبر نہیں کہ کہاں پر یہ گر رہے عادل
خلا کی پشت سے اب آسماں پھسل رہا ہے

میں سب جہانوں سے نشو و نمود میں گزرا
زمانہ مرگ کا بھی ہست و بود میں گزرا

کہاں کہاں نہ نظارہ کیا گیا اس کا
جو رہگزارِ عدم سے وجود میں گزرا

انھوں نے حمدِ خدا چاند پر اتر کے کی
ہمارا عہد یہاں دم درود میں گزرا

ملا ہے وہ مجھے لاحاصلی کے گلشن میں
زیاں کا مرحلہ بھی میرا سود میں گزرا

چل رہا ہوں ندی کنارے میں
آیا ہوں رہگزارِ عالم سے

پا چکے دسترس یہ موسم پر
اب خدا بھی نہ چھین لیں ہم سے

پھر اس کے بعد کوئی چاہے کاٹ کھائے اسے
وہ پھل کے پکنے تلک کا محافظ ہے

کہاں کھڑے ہیں کہاں ہونا چاہیے تھا ہمیں
یہ نارسائی کا دکھ تو نہ چاہیے تھا ہمیں

یہ بے کرانیاں کون و مکاں کی کس کے لیے
مرے کریم بس اک کونا چاہیے تھا ہمیں

دلوں کو مردہ کیا ارتقا کے چکر میں
دیارِ قہقہہ میں رونا چاہیے تھا ہمیں

زندگی خسارا ہے تم نہیں سمجھ سکتے
موت استعارا ہے تم نہیں سمجھ سکتے

ایک بے سہارا دل میرے واسطے عادل
آخری سہارا ہے تم نہیں سمجھ سکتے

دیکھی جا سکتی ہیں کرنیں مری پیشانی سے
میں سحر یاب ہوا تیری نگہبانی سے

رائیگاں ہوتے ہوئے اس کے کرم تک پہنچے
ریت میں ڈوبے برآمد ہوئے ہم پانی سے

میں اس طرف بڑی مشکل سے جھانک پایا تھا
مگر خدا بھی نہ حیران کر سکا مجھ کو

خدا کے ساتھ تعلق کی نوعیت یہ ہے
ہم اپنی بستی کو اب لامکاں سمجھتے ہیں

میں خواب دیکھنے سے روک تو رہا ہوں انھیں
مگر یہ لوگ نصیحت کہاں سمجھتے ہیں

مری مدد کو پھر آتی ہیں کائناتیں سبھی
خدا کو ہوتی ہیں موصول جب مری لہریں

گزاری جاتی ہیں ہر لحہ کائناتوں سے
فنا کے نور میں لتھڑی ہوئی کئی لہریں

ایک دنیا جو بنائی میں نے
اور ہی دنیا کی پرچھائیں ہے

حریمِ جان! مرے ساتھ چل تلاش کریں
کہیں سے عشق کا نعم البدل تلاش کریں

نہ کوئی مسئلہ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے
سو لازمی ہے کہ اب اس کا حل تلاش کریں

اب کس جگہ تلاش کرو گے ہمیں کہ ہم
مرنے کے بعد سوئے خدا بھی نہیں گئے

گھسیٹ لائے ہو مجھ کو جدھر سے تم عادل
حدودِ وقت سے باہر کا راستہ تھا مرا

میں اس کے رہنے کو موزوں تھا اس لیے عادل
بھٹک کے چاروں طرف پھر وہ آبسا مجھ میں

دفاعِ موت کا کرتے رہے ہیں زندگی میں
کیے ہیں ہم نے بہت ظلم اپنی جانوں پر

بدن لپیٹ کے رکھ آئے ہوتے ہیں گھر میں
ہجوم روحوں کا ہوتا ہے قہوہ خانوں پر

یہ استعارہ رہے تھے کبھی اندھیروں کا
اتر رہا ہے نیا نور جن مکانوں پر

شگاف کس نے کیا ہے خلا کے سینے میں
جہاں سے کان لگا کر سنا گیا مجھ کو

میں ویسا ہوں نہیں جیسا دکھائی دیتا ہوں
میں اک سراب ہوں فطرت ہے آسمانی مری

نئے دلوں میں اتاری نہ جا سکی عادل
پھر اس کے بعد غزل ہو گئی پرانی مری

سے کی چار دیواری کے اندر
میں جینے کی ریاضت کر رہا تھا

میں اک بوڑھا پرندہ تھا جو عادل
جواں پیڑوں سے ہجرت کر رہا تھا

ہم اپنی ذات کے کاندھوں پہ بوجھ تھے عادل
ہمیں اتار کے زیرِ زمین لایا گیا

میں تیغ لے کے ہواؤں پہ وار کرتا تھا
میں تجھ سے پہلے ترا انتظار کرتا تھا

اگائے جاتے تھے عادل گھنے درخت کبھی
کبھی خدا بھی پرندوں سے پیار کرتا تھا

گرا نہیں تھا کبھی پھر بھی میں کھڑا نہیں تھا
شکست تب ہوئی، جب وقت بھی کڑا نہیں تھا

بغیر وجہ کے آنکھوں کو نم کیا، دیکھا
دیے کی لَو سے زیادہ جہاں بڑا نہیں تھا

تمام رات کئی روشنی کے پہلو میں
کسی نے پھینک دیا صبح دم اندھیرے میں

وہ روشنی کے جزیروں کی خامشی نکلی
کلام کرتے رہے جس سے ہم اندھیرے میں

وہاں ہے موت، اندھیرا جہاں زیادہ ہو
نویدِ زندگی ملتی ہے کم اندھیرے میں

پھر اپنے واسطے تقدیر بن گئی عادل
چلا دیا جو خدا نے قلم اندھیرے میں

☆☆☆☆☆

خاموش آنکھیں

وہ کراچی پہنچ گیا تھا، فیاض صاحب کے گھر باتھ آیئر لینڈ جانے کے بجائے ساحل سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ سوچنے لگا والدین بھی اپنا حکم صادر کر دیتے ہیں۔ میرے دوست کے گھر جاؤ اور سب سے ملاقات کرنی بہت ضروری ہے۔ اگر لڑکی پسند آجائے تو اس سے بہتر رشتہ تمھیں نہیں مل سکے گا۔ پھر ایان نے خود کلامی کی۔ اتنا بڑا لاہور ہے۔ اتنی دور لڑکی ڈھونڈنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ چلو شاید اچھی ہی ہو شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ سورج کی کرنیں لہروں میں گم ہونے لگیں۔ آس پاس کے قمقمے روشن ہونے شروع ہو گئے۔ سمندر کی لہریں اور لوگوں کے ہجوم کی آوازیں ایک خاص گنگناہٹ بن کر پھیلی ہوئی تھیں۔ کئی خاندان بمعہ بچوں کے وہاں اٹھکیلیاں کرتی لہروں کو دیکھ رہے تھے۔ ایان کا جی چاہنے لگا کہ یہاں ساحل سمندر پر بنے لکڑی کے ریسٹورنٹ سے کھانا کھائے۔ فارغ ہو کر انکل فیاض کو ملے اور ان کی بیٹی کو دیکھ کر واپس آنے کا سوچے گا۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ سمندر کے کنارے ایک کشتی کی مانند جڑا ہوا تھا۔ لوگ جوک در جوک چلے آرہے تھے۔ آس پاس کی خالی میزوں پر لوگوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد سمندر کی لہروں کو جھومتے ہوئے دیکھا۔ چاروں طرف قمقمے جگمگا رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا اس طرح کے اطمینان بخش لمحات زندگی میں مل جائیں تو زندگی بڑی پُرسکون گزرتی ہے۔ پھر اُسے انکل فیاض کی بیٹی کا خیال آیا نہ جانے کیسی ہوگی۔ چلو..... جیسی بھی ہوگی مجھے کوئی غرض نہیں۔ بس یہاں کی سیر سے لطف اندوز ہو گیا ہوں۔ ورنہ شہر کا بُرا حال ہے۔ اس بارش نے کراچی کو تہس نہس کر دیا ہے۔ ایان کھانا ختم

بلقیس ریاض

کرتے ہی جانے کا سوچنے لگا، مگر چند گھڑیاں اور بیٹھنے کو جی چاہا- ابھی اُٹھنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی-

'ارے ایان میاں تم یہاں بیٹھے ہو- ساری دوپہر تمھارا انتظار ہوتا رہا ہے- چلو شکر ہے تمھیں گھر ڈھونڈنے کی دشواری نہیں ہوگی- ایان نے ان سے علیک سلیک کرتے ہوئے پوچھا-

لیکن انکل آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں-

بھئی میں امبر کو لینے آیا ہوں آج کسی سہیلی کی سالگرہ پر یہاں کھانے کے لیے آئی تھی تم تو جانتے ہی ہو یہاں کے حالات ہمیشہ سے ناگفتہ ہیں- افسوس کی بات ہے گھر پر انتظار ہو رہا ہے اور تم نے کھانا یہاں کھا لیا ہے- ایان نے امبر کی جانب دیکھا-

معصوم، بھولی بھالی...... کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی- اس کا چہرہ شگفتہ اور کھلا ہوا تھا- ایان نے اس پر ایک نظر ڈالی تو بس ٹھیک ہی لگی اور سوچا قہوہ پینے کے بہانے ان سے بات چیت یہیں پر کر لے گا اور رات کی آخری فلائٹ سے واپس چلا جائے گا-

ایان نے فیاض صاحب کو کہا-

"ابا نے آپ سے ملاقات کا کہا تھا- شکر ہے یہیں پہ ہماری ملاقات ہو گئی ہے- میرے خیال سے قہوہ اکٹھے پیتے ہیں اور میں آپ سے اجازت بھی لوں گا- دفتر والوں کی کالز آ رہی ہیں- کہہ رہے ہیں کوئی ضروری کام ہیں- فوراً آؤ-"

نہیں میاں سب گھر والے انتظار کر رہے ہیں- میں ابھی تمھیں جانے نہیں دوں گا- قہوہ گھر پی لیں گے- اول تم نے کھانا یہاں کیوں کھایا- وہ زبردستی ایان کو گھر لے گئے-

گھر میں داخل ہوئے تو رضیہ بیگم (ان کی اہلیہ) نے آگے بڑھ کر ایان کا ماتھا چوما اور مہمان کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا-

وہ مہمان کمرے میں بیٹھا ہوا تھا- کہ ایک اور لڑکی کمرے میں داخل ہوئی- ایان کبھی امبر کو کبھی آنے والی لڑکی، جس کا نام آمنہ تھا، کو دیکھنے لگا-

وہ دل ہی دل میں...... خدایا...... ان میں سے کونسی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں- ایان نے اب دیکھا- اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم سی گئیں- آس پاس کی چیزیں دھندلا گئیں- اس کا چہرہ جیسے کہہ رہا ہو- مجھے تم ناپسند نہیں کرو گے- وہ ہلکے آسمانی لباس میں آسمانی مخلوق دکھائی دے رہی تھی- وہ ایک لمحے کے لیے محو ہو کر رہ گیا- اس کی خوبصورت آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں مجھے ناپسند کرنا تمھارے لیے ناممکن ہو جائے گا- باہر خنک ہوا سے درختوں کے پتے سرگوشیاں کرتے دکھائی دے رہے تھے-

وہ بے خود سا بیٹھا۔ اس لڑکی کے سراپے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے دیوار پر دونوں بہنوں کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ ایان کو محسوس ہوا۔ جیسے اس کی تصویر میں یک دم جان پڑ گئی ہو۔ اس کے تصورات میں ایک بجلی سی کوندی۔ وہ ہوش میں آگیا اور آمنہ سے پوچھا

''آپ''

میں......وہ کھل کھلا کر ہنسی میں امبر کی بہن۔

وہ دونوں دیکھتی۔ آمنہ بات بات پر ایک خاص ادا کے ساتھ اس کی جانب دیکھتی ایان کی نگاہیں آمنہ کے چمکتے دمکتے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ نہ صرف حسین تھی بلکہ بات چیت کرتے ہوئے جب مسکرائی۔ تو دل میں اترتی چلی گئی۔ امبر اچھی تو تھی مگر اس قدر خاموش تھی کہ اس کے بارے میں کچھ اخذ نہ کر سکا۔ فیاض صاحب نے آمنہ سے کہا۔

امبر اپنے کمرے میں چلی گئی ہے اس کو بلا لاؤ اور دونوں ایان کے ساتھ بات چیت کرو۔ میرا پرانا دوست آگیا ہے میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ اور جاتے جاتے کہا۔

میں جلد واپس آتا ہوں۔

''امبر کو ڈرائنگ روم میں ضرور بلانا۔''

''جی ابو''

آمنہ امبر کو بلا لائی۔ ہنس مکھ آمنہ ایان کے ساتھ گھل مل گئی اور مسکرا مسکرا کر اس سے بات چیت کرنے لگی۔

امبر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایان نے امبر سے پوچھا۔

''آپ پڑھتی ہیں۔''

''جی''

''کہاں...... ماسٹرز کر رہی ہوں۔ میرا آخری سال ہے پھر وہ خاموش ہو گئی۔ ایان نے آمنہ کی جانب دیکھا تو شاداب گلابی چہرہ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند ہونٹ، جب ہنستی تو یوں گمان ہوتا کئی ساز بج اُٹھے ہوں۔''

اور سوچا یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا ہے کہ میں نے آمنہ کو بھی دیکھ لیا ہے میرے لیے اب انتخاب کرنا کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ فیاض انکل نے دونوں کے ساتھ بات چیت کرنے کو کہا ہے۔ ایان کے دل میں جل ترنگ بج اُٹھے۔

پھر ایان آمنہ سے مخاطب ہوا۔

''اور آمنہ آپ''

میں ایم اے کر چکی ہوں آجکل گھر داری سنبھالتی ہوں۔ اس کی چمکتی آنکھیں ایان کو اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔ گو امبر دیکھنے میں اتنی بری نہیں تھی مگر اس میں اتنی کشش نہیں تھی کہ ایان کو دیکھتے ہی۔ یوں

لگے کہ جیسے اسی کا انتظار تھا۔
رات گہری ہونے لگی تھی۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے۔ خنک ہواؤں سے کھڑکیوں کے پردے پھڑپھڑا رہے تھے۔ بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔
سماں بہت ہی رنگین اور دلکش تھا۔ آمنہ کے حسین چہرے پر سے اس کی نگاہیں ہٹتی نہیں تھیں۔ پہلی بھرپور نظر میں وہ اس کی طرف کھنچا ہوا دل ہی دل میں۔ منصوبے بنانے لگا۔ میں آمنہ کو پرپوز کروں گا۔ پھر امبر کی جانب دیکھا۔ امبر مسلسل خاموش بیٹھی تھی۔
قہوہ بن کر آگیا اور امبر نے بنا کر اس کو ایک کپ پیش کیا تو ایان نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ حیا سے شرما رہی تھیں۔
''شکریہ''
فیاض صاحب جلدی جلدی اپنے دوست کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد رضیہ بیگم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔
اور کہنے لگے۔
ایان مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ لاہور سے خاص ہمارے لیے آئے ہو۔ جانتے ہو تمھارا باپ میرا عزیز دوست اور کلاس ہے۔ دیکھو بیٹا میں ایک روشن خیال باپ ہوں۔ پہلے وقتوں میں بزرگ ہی رشتہ طے کر دیا کرتے تھے مگر آج کے دور میں بچوں کی پسند اور ناپسند کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ شادی عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لیے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔ پھر جو بھی رائے ہو بچوں کی اس کو مقدم جانتے ہوئے شادی کر دینی چاہئیں۔ تم چاہو تو علیحدگی میں بھی بات چیت کر سکتے ہو۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔
رضیہ بیگم اور آمنہ دونوں ہی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ایان بات نہ بھی کرتا تو ایک نظر میں ہی اس نے آمنہ کو پسند کر لیا تھا۔ اس کو دیکھ کر لگا کہ یہ ایک ایسی کشش ہے جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی گرفت میں جکڑا سا گیا تھا۔ وہ ایک پل میں ہی اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ سامنے امبر بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر آمنہ کی طرح یہ بھی بات چیت میں خوب ہنستی سمارٹ لباس میں ہوتی تو اس میں بھی مجھے جاذبیت نظر آتی مگر وہ تو بات نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔
امبر اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھکائے مسلسل خاموش بیٹھی تھی۔ ایان نے کہا۔
یوں لگتا ہے کہ آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔
اس بات سے وہ مسکرا پڑی۔ اور پوچھا۔
آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔

میں نے سی ایس ایس کیا ہے اور آجکل اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔

"اوہ"

پر......ایان نے پوچھا۔

آپ دونوں بہنیں جڑواں ہیں۔ آپ دونوں کی شکلیں بہت ملتی ہیں۔ ایک بڑی ہنس مکھ اور دوسری خاموش۔ آپ صحیح سمجھے۔ ہم جڑواں بہنیں ہیں۔"

"شادی کے بعد آپ کیا کریں گی۔ جاب یا۔"

ابھی پوری بات کی ہی نہیں تھی کہ امبر نے کہا۔

گھرداری آمنہ کی طرح سنبھالوں گی۔

آمنہ کے نام سے اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تو یوں کمرے سے چلی گئی جیسے اس زمین پر تھی ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ امبر نے اپنے سلے ہوئے لب کھولنے شروع کیے تو ایان کو وہ قدرے بھلی لگنے لگی۔ اگر آمنہ کو نہ دیکھتا تو گھر جا کر امبر کے متعلق رائے دے دیتا۔ بس ٹھیک ہی لگی ہے۔ آگے آپ کی مرضی، مگر آمنہ کو دیکھ کر اس نے سوچا جا کر اعتراف کرے گا کہ آمنہ اس کو بہت پسند آئی ہے۔ آپ آمنہ کا رشتہ ان سے مانگیں۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ایک لڑکا کمرے میں فیاض صاحب کے ساتھ آیا اور اس نے ایان سے ہاتھ ملایا۔ ایان یہ شاہد میرا داماد آمنہ کا شوہر ہے۔ خاص تمھیں ملنے کے لیے آیا ہے۔" ایان۔ کو فیاض صاحب کے الفاظ دور سے آتے ہوئے سنائی دیئے۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس سے بات چیت کر رہا تھا وہ ایک شادی شدہ لڑکی نکلے گی۔ تاریک تصورات میں ایک بجلی سی کوندی۔ باہر گھرے بادل چھائے تھے۔ فضاؤں میں اداسی رچی تھی۔ کہاں وہ آمنہ کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا اور اچانک حسین خواب ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔

خیالوں کی دھوپ چھاؤں میں۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کہیں اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ مگر ایک لمحے میں ہی کسی نے اس کی خوشیوں کو آگ لگا دی تھی۔ سامنے بڑی بڑی خاموش آنکھیں اسکی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مگر ایان کو یوں لگ رہا تھا ایک چمکتا دمکتا ستارہ آنکھوں سے اوجھل ہو کر۔ آسمان کی بلندیوں میں سما گیا ہو اور سامنے صرف خاموش آنکھیں اس کی منتظر ہوں۔

اس نے صوفے کی پشت پر اپنا سر ٹکا دیا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں بہت دور نکل گیا تھا، مگر وہ آنکھیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

تھانہ چوکی اور معشوق

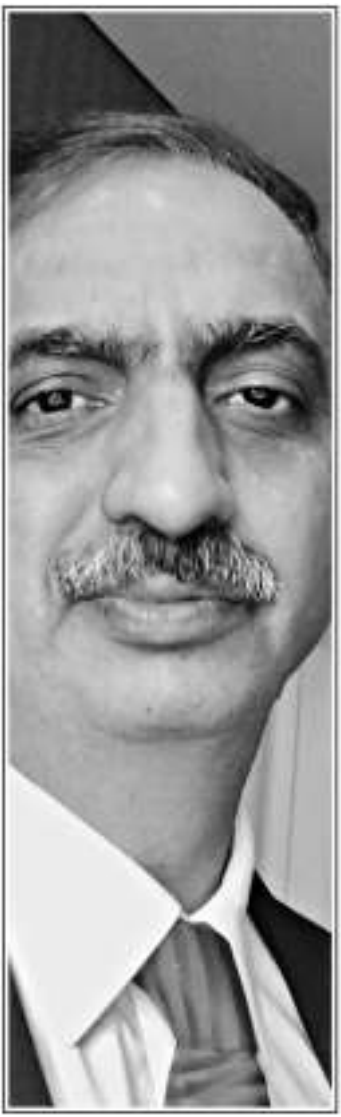

حبیب الرحمٰن

کٹائی ختم ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ گندم دانوں کی شکل میں کسانوں کے بھڑولوں میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی کھلیانوں کی زمین بھوسے سے اٹی ہوئی تھی۔ دوپہر کو سورج سوا نیزے پر آ کر زمین کو بھانبڑ بناتا تو لو اور بھوسہ ملی مٹی مل کر ایک خاص قسم کی خوشبو سے سارے منظر پر حاوی ہو جاتے۔ فراغت کے ان دنوں میں کسان بارہ ایک بجے مال ڈنگر کو کسی سایہ دار جگہ باندھنے کے بعد مٹی کے بنے ٹھنڈے کچے گھروں میں دبکتے تو گاؤں کی ساری گلیاں سنسان ہو جاتیں۔ بیساکھ کی ایسی ہی ایک سنسان دوپہر معشوق علی اور انور بیری کے ایک درخت تلے بیٹھ کر بیروں سے پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پتھر مار مار کے بیر گراتے رہے لیکن پھر پیاس لگنے پر گاؤں کی مسجد کی جانب چل پڑے جہاں کچھ دیر وہ سستا بھی سکتے تھے اور اللہ سے اپنی دعاؤں کو مانگ بھی سکتے تھے۔

معشوق علی کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی جبکہ انور علی دس گیارہ سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ معشوق علی تیسری جماعت سے انور علی کا ہم جماعت تھا اور اب وہ انور علی کے تعاون سے ہی پڑھائی کے تمام مرحلے سر کرتا جا رہا تھا۔ معشوق علی کا باپ کچہری میں کسی وکیل کا منشی

تھا جبکہ انور علی کا باپ چھوٹی موٹی زمینداری کے علاوہ ان دونوں کے سکول کی چوکیداری بھی کیا کرتا تھا۔ ہم جماعت ہونے کے علاوہ دونوں کی دوستی ان کے ملتے جلتے گھریلو حالات کی وجہ سے بھی تھی۔ معشوق علی کی ماں چار سال پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور بعد میں خلع لے کے جانے کہاں رہتی تھی جبکہ انور علی کی ماں پانچ سال پہلے سانپ کے کاٹنے سے مر گئی تھی۔ دونوں اکلوتے تھے اور گرمیوں کی چھٹیوں کے دن یونہی بتاتے۔

دونوں کے والد صبح سویرے اپنے کام دھندے کے چکر میں گھر سے نکلتے اور شام ڈھلے واپس لوٹتے۔ معشوق علی کے باپ نے اسے حافظ بنانے کے لیے دو تین سال پہلے کچھ عرصے کے لیے مدرسے بھی چھوڑا تھا لیکن وہ وہاں سے روز بھاگ آتا اور آخر کار ایک دو سال ضائع کرنے کے بعد پھر سے سکول داخل ہو گیا۔ مدرسے جانے کا معشوق کی زندگی پر اثر ہوا یا نہ ہوا لیکن اس کا بیانیہ بہرحال قدرے اسلامی ہو گیا جو پہلی ملاقات میں دوسرے شخص کو متاثر ضرور کرتا۔

معشوق علی اور انور گاؤں کی ویران مسجد میں ہینڈ پمپ سے وضو کرنے والی ٹینکی کو بھر کر کچھ دیر ثواب کمانے کی کوشش کرتے رہنے کے بعد مسجد کی چٹائی پر لیٹ گئے۔ جیب میں پڑے بیروں سے بھوک مٹانے کی ایک اور ناکام کوشش کے بعد وہ کچھ دیر مسجد کی ٹونٹیوں سے منہ لگا کے پانی پیتے رہے۔ اس عرصے میں دونوں نے اپنے پرنے (سر پر لیا جانے والے بڑا رومال) گیلا کر لیے۔ انہیں عصر کی نماز کے بعد شاہ جی سے قرآن کا سبق لینا تھا اور عصر ہونے میں ابھی ڈھیر سا وقت باقی تھا۔ دونوں نے گیلا پرنا سر پر رکھا اور دوبارہ مسجد سے باہر ویران گلیوں میں نکل آئے۔ جوتوں کے باوجود تپتی زمین پاؤں نیچے دھرنے نہ دے رہی تھی۔ دیواروں کا سایہ بمشکل سارے گاؤں کا پانی چھپڑ تک لے کر جاتی ہوئی نالی تک پہنچ رہا تھا۔ دیوار سے لگی ایک مرغی کو دیکھ کر معشوق رک گیا اور اپنا گیلا پرنا سر سے اتار کر مرغی کے اوپر دھپ سے گرا دیا۔ مرغی نے تھوڑی سی کڑکڑ کی لیکن پھر خاموش ہو کر گیلے پرنے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ معشوق نے ڈرے ہوئے انور کو دیکھا اور ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ ان کی منزل معشوق کی رسوئی (باورچی خانہ) تھی۔

یہ غلط ہے --- گناہ ہے ---- انور حوصلہ کرتے ہوئے بولا

اگر اللہ نے ہم بھوکوں کے لیے کوئی سبب پیدا کر ہی دیا ہے تو ناشکری نہیں کرتے ---- معشوق اسے قائل کرتے ہوئے بولا

مجھے مرغی ذبح کرنی نہیں آتی ---- انور ہار مانتے ہوئے بولا

پہلے کون سا حلال ہے -- معشوق ہنستے ہوئے بولا اور اسے سوکھی لکڑیاں اکٹھی

کرنے کے احکام جاری کرتے ہوئے پکانے کے بقیہ مراحل طے کرنے لگا۔ عصر سے پہلے جب وہ دونوں واپس مسجد لوٹے تو کتنے ہی دن بعد ان کا پیٹ صحیح معنوں میں بھرا ہوا تھا۔

عصر کی نماز کے بعد وہ مسجد کے امام صاحب سے قرآن کا سبق لیتے۔ جس کے بعد شام تک گلی ڈنڈہ اور اپنے والدین کا انتظار ان کا معمول ہوتا۔ شام کی نماز کے آس پاس دونوں کے والد گھر آجاتے جن کے ساتھ وہ رات کا کھانا کھاتے اور ان کی مدد سے لالٹین کی روشنی میں سکول کا کام کرنے کی کوشش کرتے۔

اتنی قربت اور دوستی کے باوجود سکول میں معشوق کا رویہ مزید حاکمانہ ہو جاتا۔ یوں تو وہ دسویں جماعت تک اکھٹے پڑھے بلکہ یوں سمجھیے کہ انور نے پڑھا اور معشوق علی دھونس اور زورازوری کرتے ہوئے اس کی نقل کرتا رہا۔ امتحان میں انور کو پرچہ قدرے سامنے رکھ کر لکھنا پڑتا دوسری صورت میں معشوق علی اس کی کمر میں اس زور سے قلم چبھوتا کہ وہ پرچہ بھول کر کتنی ہی دیر کمر ملتا رہتا۔ اگر وہ کبھی بغاوت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پرچہ چھپا کر لکھنے کی کوشش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو سکول سے باہر معشوق علی برسوں کی دوستی کو پس پشت ڈال کر اسے گریبان سے پکڑنے کے لیے تیار کھڑا ہوتا۔ اس سب کے باوجود نتیجہ آنے پر معشوق علی سب سے پہلے انور کے گھر مٹھائی لے کر پہنچتا اور بار بار انور علی کو بتاتا کہ اللہ نے اس کی وساطت سے ایک غریب کو مزید آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

دسویں کے امتحان میں انور علی کی فرسٹ ڈویژن آئی جبکہ معشوق بمشکل پاس ہوا۔ یوں تو انور مزید پڑھنا چاہتا تھا لیکن جب معشوق کے والد نے ان دونوں کو پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے کہا تو وہ گھر کے حالات دیکھتے ہوئے انکار نہ کر سکا۔ معشوق کے والد کی سفارش کے ساتھ دونوں نے دوڑ اور میڈیکل کے مراحل پاس کر لیے لیکن آخری مرحلے مین جب ان سے رشوت کے طور پر بیس بیس ہزار روپے مانگے گئے تو انور علی بگڑ گیا۔

پیسوں کا انتظام میرا ابا کر دے گا۔۔ معشوق نے دوست کو سمجھاتے ہوئے کہا۔۔ اللہ اگر ہم پر مہربان ہے تو انکار سراسر کفران نعمت ہے۔۔۔

رہن دے معشوق۔۔۔ انور تلخی سے بولا۔۔۔ مجھے رشوت دے کے بھرتی نہیں ہونا۔۔

معشوق پولیس میں بھرتی ہو کر راولپنڈی چلا گیا اور انور باپ کی گالیاں کھاتے ہوئے گاؤں لوٹ آیا۔ اس کا داخلہ قریبی شہر کے کالج ہو گیا۔ معشوق سے جو زندگی بھر کا ساتھ تھا اب کم کم رابطے میں بدلنے لگا اور پھر جب معشوق کا والد بھی گاؤں چھوڑ کر بیٹے کے پاس منتقل ہو گیا تو رہا سہا رابطہ بھی نہ رہا۔

چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے وظیفے

حاصل کرتے انور آگے بڑھتا رہا۔ اس سفر میں معشوق کے بعد اس کا والد بھی بچھڑ گیا اور گاؤں سے رابطہ بھی نہ رہا۔ وہ بچہ جس کا بچپن کسمپرسی میں گزرا تھا اب بڑی گاڑیوں میں سفر کرتا کبھی گزرے دنوں کی یاد آتی تو معشوق بھی یاد بن کر اسے اداس کرتا۔ گاؤں سے آنے والوں سے وہ معشوق کی خبر لینے کی کوشش کرتا لیکن کچھ پتہ نہ چلتا۔ ایسے ہی ایک دن ماضی کی یادوں میں گم جب وہ ڈپلومیٹک انکلیو (diplomatic enclave) سے گزر رہا تھا اسے شائبہ سا ہوا کہ ایک سفارتخانے کے سامنے پولیس کی وردی میں لمبی سی داڑھی والا معشوق ہی ہے۔ ابھی وہ گاڑی روک کر اپنے وسوسے کو یقین میں بدلنے ہی والا تھا کہ سامنے بیٹھا پولیس والا دوڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور --اوئے--انورتو--- کہہ کر اس کے گلے سے لگ گیا --------

گاؤں کے قصے بچھڑے ہوئے دنوں کی باتیں جانے والوں کے غم--- کتنی ہی دیر وہ سردیوں کی دھوپ میں بیٹھے باتیں کرتے اور قرمبی ڈھابے کی بنی چائے پیتے رہے ---- تیرا بھائی اے ایس آئی ہوگیا ہے-- معشوق نے اپنے کندھے پر لگے پھول پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا--

بادشاہی ہے تیری تو--انور اس کے آگے پیچھے کھڑے سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے بولا بادشاہی --- معشوق اداسی سے بولا --- بادشاہی نہیں سزا کے طور پر یہاں دھکے کھا رہا ہوں---

مطلب--انور نے استفسار کیا

آزمائش سمجھ لے --- معشوق اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا--- اللہ اپنے بندوں کو مشکل میں ڈالتا ہے --- میرے لیے تو اپنا گھر بنانا ہی عذاب بن گیا--- اچھا خاصہ گولڑہ کی ایک چوکی پر بادشاہی کر رہا تھا کہ کسی حاسد نے شکایت کردی۔

اپنی زمین پر اپنے گھر کی تعمیر نہ ہوئی کوئی جرم ہوگیا------اے ایس آئی ایک کنال کا گھر کیسے بنا سکتا ہے --- معشوق دکھ بھرے لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا --اب بندہ گاؤں بدر ہو تو کیا بال بچے کے لیے شہر میں مکان بھی نہ بنائے---

سارا پریس پیچھے لگ گیا--- معشوق تلخی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا----- دنیا کی ہر شے ان کی نظر میں تنخواہ سے بنتی ہے---ایک ایک روپیہ جوڑ کر برسوں میں اگر کچھ بنانا شروع کر ہی دیا ہے تو ان سب کو برا لگتا ہے ---انہیں اللہ کی رحمت پر یقین ہی نہیں انہیں دوستوں کی محبت اور چاہنے والوں کی کرم نوازی کا اندازہ ہی نہیں----- حاسدین کو جب کچھ نہیں ملا تو پہلے معطل کرایا اور اب سزا کے طور پر پروٹوکول ڈیوٹی پر یہاں لگا دیا ہے --- معشوق رقت آمیز لہجے میں اسے رخصت کرتے ہوئے بولا

انور--- تجھے اب میں گھر بلاؤں گا لیکن جب میں چوکی واپس تعینات ہو جاؤں گا اور گھر بن جائے گا--- اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں اندھیر نہیں--- انور نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور فون نمبروں کے تبادلے کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

معشوق کا کچھ عرصے بعد ڈپلومیٹک انکلیو سے تبادلہ تو ہوا لیکن چوکی اسے واپس نہ کی گئی اب اسے کراچی کمپنی تھانے میں بھیج دیا گیا۔ اے ایس آئی تو وہ یہاں بھی تھا لیکن وہ بادشاہی نہ تھی جو چوکی پر تھی--- انور نے ایک دو بار رابطہ تو کیا لیکن وہ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں پریشان ہی لگا--

چوکی واپسی ہو گئی--- گھر بن گیا--- کوئی چھ ماہ بعد معشوق کی کال آئی تو انور نے چھٹتے ہی سوال داغا---

چوکی تو نہیں ملی--- معشوق ہنستے ہوئے بولا --- لیکن ایک بار پھر معطل ہوں لیکن اس مسبب الاسباب کی رحمت سے گھر مکمل ہونے ہی والا ہے--- مجھ جیسے گنہگار کی بھی سن لی مالک نے-----

کیسے--- انور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا

جب چوکی سے نکلا تھا تو اچھا خاصا تعمیراتی کام ایک دم سے رک گیا تھا--- وہ اپنی کتھا سناتے ہوئے بولا-- چوکی میں تو اللہ کی رحمت تھی معطل ہو کر اور پروٹوکول ڈیوٹی لگنے کے بعد تنگی نہاتی کیا اور نچوڑتی کیا۔ مرمرا کے تھانے بحالی تو ہوئی لیکن وہ فراوانی کہاں جو چوکی میں ہوا کرتی تھی--- رات رو رو کے اللہ سے مانگا کرتا--- معشوق نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے--- اللہ سے عرض کرتا کہ مولا کوئی صورت پیدا کر تو تو پتھر میں سے کیڑے کو رزق دیتا ہے مجھے تھانے میں رزق کی وسعت عطا کر----- اور پھر اللہ نے سن ہی لی--

معشوق اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ----- پچھلے ماہ میری ڈیوٹی قتل کے ایک ملزم کو اڈیالہ جیل سے عدالت لے کے جانے کی لگی----- راستے میں گفتگو شروع ہوئی تو باتوں باتوں میں گھر کے لینٹر (concrete lanter) کا قصہ آ گیا ------- ہم دونوں مشکل میں تھے اور اللہ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی مشکل کا حل بنا دیا ---------- کچہری پہنچنے سے پہلے ہی ملزم مجھے زخمی کر کے فرار ہو گیا--

اوہ--- انور پریشانی سے بولا--- تم ٹھیک تو ہو----

ٹانگ میں گولی تو لگی ہے ---- معشوق نے دوبارہ اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا -- لیکن گھر کی تعمیر کا کام پھر سے شروع ہو گیا ہے --- ایک بار پھر معطل ہوں لیکن کل کلاں بحال بھی ہو جاؤں گا -- اللہ نے چاہا تو ملزم آج نہیں تو کل پھر پکڑا جائے گا -- اللہ کا فضل اور تجھ جیسے دوستوں کی دعائیں رہیں تو زندگی اپنے ڈھب پر چلنے لگے گی۔

☆☆☆☆☆

رحم دل

''جی کہاں سے آئے کھانا؟ آٹا زیادہ گوندھنے کا مقصد سمجھتی ہوں تیرا، تاکہ روٹیاں بچیں اور گھر جاتے ہوئے سمیٹ کے لے جاؤں۔ مسکین صورت سے کہتی ہے، کھانا بچا ہے تو دے دیں جی، کوئی کھانا وانا نہیں، چھان بورے میں دوں گی، عقل آئی ٹھکانے پر..... اور ہاں کام کرنا ہے تو بندہ بن کر کرو ورنہ نوکرانیوں کی کمی نہیں، ایک چھوڑ دسیوں پھرتی ہیں ہاتھ جوڑتی۔''

رسولاں نے پہلو میں کھڑی نجو کے مرجھائے مرجھائے چہرے کی طرف دیکھا جو صبح سے بھوکی تھی، رسولاں بھی یہ سوچ کر نجو کو لے آئی تھی کہ کوٹھی والوں کا کھانا کھا کر پیٹ بھر لے گی۔ نجو کو چھ سات ماہ کی عمر سے ہی بھوک وافلاس نے گود لے کر لوریاں دینا شروع کر دی تھیں۔ بیگم صاحبہ کی خلاف توقع تلخ کلامی نے رسولاں کو لہو کے گھونٹ پلا دیئے تھے، اُسے امید نہیں تھی کہ دوپہر کو بھی بچوں کو بھوکا رہنا پڑے گا اور بیگم صاحبہ نے تو جیسے آئندہ دنوں کا بھی فیصلہ سنا دیا تھا رسولاں کے ذہن میں نئی نوکری کی تلاش، معذرت کرنا، بیگم صاحبہ کا موڈ بدلنا یا بچوں کے لیے فی الحال کہیں سے دو لقموں کا بندوبست کرنا، ہر سوچ نے یکدم طوفان برپا کر دیا۔ اُس کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی قابض ہوگئی تھی۔

''ہائے میری بچیوں کے پیٹ میں باسی کھانا بھی نہیں، بچا کھچا لقمہ بھی نہیں، پہلی کو صاحب پیسے دے گا۔ دو چار دن کیسے کٹیں گے۔ اور..... بنی بھی سکول سے بھوکی آئے گی۔ نصیبوں جلی کو صبح بھی لقمہ نصیب نہیں ہوا۔

نجو کی بھک اور بنی کے سکول کا سوچتے ہی رسولاں کا کلیجہ تڑپ اُٹھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے انگارے گرنے لگے، جو جہاں گرتے آگ ہی لگاتے جا رہے تھے۔ وہ شرمندگی چھپانے کے لیے نجو کا معصوم گول چہرہ دونوں ہاتھوں میں یوں چھپانے لگی جیسے اسے جنم دے کر کوئی جرم کر

گل زیب عباسی

بیٹھی ہو۔ رسولاں میلے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے حویلی کا بڑا گیٹ دھیرے دھیرے پیچھے چھوڑ آئی۔ ماں کی اُنگلی تھامے معصوم نجو نے ماں کے گرتے آنسو دیکھے تو ہاتھ کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔

”اماں! بیگم صاحبہ نے اگر کھانا دیا نا میں نہیں کھاؤں گی، بنی اور تم دونوں کھالینا۔ میں سو جاؤں گی۔ مجھے بھوک نہیں لگی اماں، کھانا تو کھائیں گے نا، روتی کیوں ہو“

نجو کے معصوم بول رسولاں کے دل پر تیر کی مانند لگے، اُس کا افلاس زدہ جسم بکھرنے لگا وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ احساس زہر کی طرح پورے جسم میں پھیلتا گیا کہ بھوکا بچہ ماں کی ممتا کو بہلاتے ہوئے کہہ دے کر مجھے بھوک نہیں۔ رسولاں سے اس کی ممتا بھی جیسے باغی ہو گئی تھی۔ اُس نے جلدی سے نجو کو ٹانگوں کے ساتھ بھینچ لیا۔

”او میرے چاند گھر میں ہے ہی کیا جو بنی کھالے گی۔“

آنسوؤں نے رسولاں کے چہرے پر افلاس اور بے چارگی کی تصویریں 'پینٹ' کر دیں تھیں۔ اُس کی پور پور اُمیدوں نے مزید چور چور کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی تلخی بھرے لفظ ابھی تک کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ زہر میں بجھے لفظوں نے رسولاں کو نہیں یتیم بچوں کی ممتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ وہ ممتا کو سنبھالتے سنبھالتے گلیوں سے گزر رہی تھی۔ اُسے یہی فکر کھا رہی تھی کہ بنی کے لیے کہیں سے کسی گھر سے بچے کھچے ٹکڑے مل جائیں۔ اُس کا برابر ارادے بُن رہا تھا۔

”بنی ــ نجو ــ تڑپ تڑپ کر روئے گی۔ اس کو سے پتا کروں شاید من میں رحم آ ہی جائے۔ ہے تو وہ بھی بے رُخی شاید، تقدیر اُلٹی چل جائے۔ زندگی؟ میں تو کہوں بے رحم آسیب ہے زندگی۔ ہاں، ہاں بے رحم، جسے چمٹ جائے قبر میں پہنچا کے دم لے۔ ہائے ہائے بنی، نجو نہ ہی جنتی، یا پھر میرو نہ مرا ہوتا، باپ کے بغیر بچے۔ ہائے موت کو پل پل گلے لگاتے ہیں۔ بنی کرماں سڑی تو صبح سے بھوکی ہے“

رسولاں طرح طرح کے خیالات سوچتی دو گلیاں گزر آئی تھی۔ وہ اپنے کچے سے گھر کو منھ چڑاتے دیکھ کر مایوس سی ہو گئی۔ کچی دیواروں والا گھرانہ مٹی سے لپا پوتا جہاں رسولاں نے نجو اور بنی کے ساتھ خاوند میرو کو آخری بار کفن میں دیکھا تھا اور ساری زندگی کے بھاری بھرکم دکھوں سے نبرد آزما ہونے کا عہد کیا تھا۔ یہی گھرانہ تھا جہاں رسولاں نے راحت اور خوابوں بھری پہلی رات گزاری تھی۔ اسی گھر کی کچی دیواریں کلر زدہ ہو کر جھڑنے لگیں تھیں۔ نجو نے گھر قریب آتے دیکھا تو چلائی۔

”اماں! تم گھر جاؤ، بنی آ گئی ہو گی سکول سے“

اور پھر بھاگ کر ہم جولیوں سے جا ملی۔
نجو نے گھر کی جانب اشارہ کر کے رسولاں کے سینے میں ایک اور تیر پیوست کر دیا تھا۔ گھر میں تو راحت، خوشی ہوتی ہے اور میرے گھر میں تو گھٹنے گھٹنے بھوک بھری ہے۔ گھر میں آسودگی کی دیوی نہ مسکرائے تو گھر کیسا، مسائل کا دفتر گھر تو نہیں ہوتا، کئی خیالات رسولاں کے دماغ میں ایک دم آ بسے تھے۔ رسولاں کا گھر سلگتے دیئے کی مانند تھا، جہاں دھواں دیئے کی زندگی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی گھر میں بیگانگی اور بے بسی میں لپٹی ہوئی داخل ہوئی تو اندر قدم رکھنے سے قدرے ہچکچا رہی تھی۔ اس کا اعتماد، جرأت اور حوصلہ بیگم صاحبہ نے چھین لیے تھے وہ گویا خالی بدن لے کر آئی تھی۔ گھر میں اکلاپا پھنکار رہا تھا، اکلاپے کی پھنکار سے رسولاں کا بدن نیلاہٹ میں رنگنے لگا تھا۔ اپنے بدن کو جون بدلتی فقط رسولاں ہی محسوس کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ رسولاں کا بدن بھی دامن چھڑا لیتا وہ پلاسٹک کی بالٹی کی جانب لپکی تاکہ ہمسائی نذیراں کے گھر سے نل سے پانی بھر لائے۔ بھوکے کو روٹی ہی سوجھتی ہے۔ رسولاں میں بچوں کی جان روٹی روٹی کی دہائی دے رہی تھی۔

''نذیرو!..... گھر میں تو ہو گی۔ پوچھتی ہوں آٹے کا، ادھار ہی مل جائے، بیٹی، نجو کے لیے ہی روٹی خرید لائے باقی خیر سلا ہے..... شاید رات کی باسی روٹی کے ٹکڑے، بچے ہوں، پوچھوں تو بھلا''

وہ روٹی روٹی پکارتی سانسوں کے لیے نذیرو کے گھر آئی نذیرو کو دیکھو کو چہرے پر مصنوعی بشاشت لے آئی، بالٹی نل کھول کر نیچے لگا دی۔ نل سے پانی شرر شرر کر کے بالٹی میں گرنے لگا تو رسولاں نے من میں شرر شرر کرتے خدشات کو سہارا، مرتی کیا نہ کرتی۔ روٹی ہی تو مفلس کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جی کڑا کر کے آگے بڑھی۔

''نذیرو!.....کی نذیراں، اڑیئے آج آٹا کلو دے دے پیسے آتے ہیں تو لوٹا دوں گی''

رسولاں کو یکدم میرو یاد آ گیا جو کبھی کفایت شعاری کو کہتا تو رسولاں کہتی، پیدا کرنے والا روزی بھی دے گا۔ میرو کہتا، بھاگوان، خدا آسمان سے بوریاں بھر کے نہیں پھینکتا، آدمی کو عقل کس لیے دی ہے۔ الٹے تلتے نہیں کرنے چاہیے۔ آدمی کا مانگتے ہوئے یا مرتے ہوئے منہ ٹیڑھا ہوتا ہے، اور اب رسولاں کو منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کربناک لمحات سے گزرنا پڑا تھا۔ مرد کے بغیر عورت بھی فضول اور بے کار سی چیز نظر آتی ہے، رسولاں اسی احساس کی آگ میں جھلسی جا رہی تھی۔ ٹھگنے قد کی نذیراں نے برتن نل کے کھرے میں دھونے کے لیے لار کھے۔

''آج کام پہ نہیں گئی کیا؟''

''گئی تھی اڑیئے مگر بیگم صاحبہ نے تو سات ون کپڑوں میں آگ لگا دی، نذیرو غریبی

امیری خدا کی دین ہے لیکن امیر لوگ غریبوں کو حقیر کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ جانوروں کی جون میں شامل کرتے ہیں، بنی بھی سکول بھوکی ہی گئی تھی، رات کا کوئی باسی ٹکڑا بھی نہیں تھا، کرماں سڑی پانی سے بھگو کر حلق میں اتار لیتی، سوچا صاحب کے ہاں سے بچا کھچا کھانا لے آؤں گی مگر بیگم صاحبہ نے وہ سنائیں کہ مت پوچھ، کہنے لگی، کب تک کھلائیں گے مفت میں، چھان بورے میں ڈال دیں گے، میرو نہ مرتا میں مرجاتی، بچیاں تو پل جاتیں، عورت ذات میں کہاں کہاں دھکے کھائیں گی۔''

رسولاں کی آنکھوں کے قریب ہی کہیں گھٹا جمی تھی۔ جھٹ برسنے لگیں۔ نذیرو سے رسولاں کے گھر کی حالت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ بچیوں کے نام سے اندر کی ماما جاگ اٹھی۔

''خدا خیر کرے گا، روتی کاہے کو ہے، تو لے جا آٹا ایک نہیں دو کلو، اور بے شک نہ لوٹانا بچیاں کھالیں گی دعائیں دیں گی۔''

''رب تیرا بھلا کرے، نذیرو چلو پیٹ میں تو کچھ پڑے گا''

تو نجو کو بھی کہیں کام پر رکھوا دیتی۔'

''نجو کو؟''

''ہاں تو''

''نہ نہ بہن، گھروں میں خود کام کرلوں گی بچی کو نہیں بھیجوں گی، امیروں کے لچھنوں کا پتا ہے، بچاری سات سال کی ہے کسی نے برا بھلا کر کے گلا دبا دیا تو کیا کرلوں گی، سبھی جانتے ہیں رسولاں کا کون ہے دنیا میں، مرجاؤں گی غلطی نہیں کروں گی۔ سکول کا سوچ رہی ہوں۔ اب تو حکومت کتابیں بھی مفت میں دیتی ہے، دو حرف پڑھ لے گی تو عقل آجائے گی۔''

''ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہے تو''

''کوٹھیوں میں رہنے والے بڑے بے رحم اور ظالم ہوتے ہیں نذیراں، کئی نوکرانیاں حاملہ ہوگئیں، بچوں کو پیٹتے ہوئے ذرا خوف خدا نہیں کرتے، میں نے خود زہرا کی چھوٹی کو دیکھا، اُس کی بیگم صاحبہ نے بچاری کے ہاتھ گرم چمٹے سے داغ دیئے۔ قصور کیا تھا، واٹر سیٹ'' بچی سے گر گیا۔ واٹر سیٹ خود سے بھی تو ٹوٹ سکتا تھا۔ ہائے معصوم کے بازوؤں پر اتنے بڑے چھالے میری آنکھوں نے دیکھے، غریبوں کی تھانوں میں کہاں دال گلتی ہے بی بی، تھانے بھی امیروں کے حق میں بات کرتے ہیں۔ میں تو نجو کو کام پر نہ بھیجوں، مرنے کے بعد نصیب جلیوں کے نصیب میں جو لکھا ہے دیکھ لیں گی۔''

نذیرو دو کلو سے بھی زیادہ آٹا تانبے میں لائی تو رسولاں کے چہرے پر تازگی نے یوں بہار بکھیری جیسے خاک میں سیندور مل گیا ہو۔ اُس نے دوپٹے کے پلو میں ہی آٹا زمین پر بیٹھ کر باندھ لیا۔ رسولاں کے منھ سے نذیرو کے وہ بچے بھی دعائیں لے رہے تھے جو ابھی دنیا

میں بھی نہیں آئے تھے۔ خالی پیٹ نجو بھی کہاں تک کھیلتی، ماں کو دوپٹے میں کچھ باندھے دیکھا تو بھاگ کر آئی۔ ایک نظر چھوٹی سی گٹھڑی پر ڈالی، بھوک پیٹ کے غار سے شیر کی مانند دھاڑتے لبوں تک آ گئی۔

''اماں! گٹھڑی میں کیا ہے؟ کیا لائی ہو اماں؟''

''آٹا ہے پتر، تیری ماسی نذیرو نے دیا ہے، اب جلدی سے چولھے میں گھاس پھوس پھینک، میں آٹا گوندھ کر روٹی بنا دیتی ہوں اپنی دھی کو، ماں صدقے صبح سے کچھ نہیں کھایا میری بچی نے۔ پرسوں کی دال میں نے کٹوری میں رکھی تھی، گرم کر لیں گے، لے اب جلدی کر، آتی ہو گی بنی بھی''

اس وقت ماں بیٹی کے لیے کل کائنات یہی آٹا تھا، اناج خدا کی نعمت، عظمیٰ ہے، اگر اناج پیٹ کی آگ ٹھنڈی نہ کر پاتا تو انسان، انسان کی بوٹیاں تک نوچ لیتا۔ اس وقت بھی غربت زدہ گھرانے میں اناج ہی نے طمانیت اور راحت کا شامیانہ تانا تھا۔ رسولاں آٹا گوندھنے لگی اور نجو ننھے ننھے پاؤں سے بھاگ بھاگ کر گلیوں سے گھاس پھوس اور ردی کاغذ جمع کرنے میں جت گئی۔ گلی سے گزرتے سکولی بچوں کی قلقاریوں کے ساتھ ہی بنی بھی گھر میں داخل ہو گئی۔ تیرہ چودہ سالہ بنی کے لیے اس وقت آٹے کا گوندھا جانا اچنبھے سے کم نہ تھا۔

''مہمان آئے ہیں اماں؟''

''نہیں بنی صبح تو جو بھوکی سکول گئی تھی، تیرے لیے روٹی بنا رہی ہوں۔''

مرچ کی چٹنی اور باسی دال کا مزا ماں بیٹیوں کے لیے ''لنچ'' سے کم نہ تھا، پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد نجو تو بھاگ کر دوبارہ ہم جولیوں کی رونق بن گئی۔ بنی سکول کا کام لے کر بیٹھ رہی اور رسولاں دھونے والے کپڑوں کا ڈھیر لے کر نذیرو کے نل کے آگے جا بیٹھی۔ سرد موسم میں ٹھنڈ اور بھی بپھری جا رہی تھی۔ کپڑے دھوتے دھوتے ہی رسولاں کا جسم درد محسوس کرنے لگا۔ کپڑے تو رسولاں نے دھو لیے لیکن جسم کی پور پور میں درد اور ٹیسیں چھن چھلاک رکھڑی ہو گئیں۔ ہر سانس کے ساتھ ہائے نکل رہی تھی۔ آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ ماں کا اچانک بیمار ہونا نجو اور بنی کے لیے پریشان کن تھا۔ گھر کی خاموشی میں وہ بھی حصہ بن گئیں۔ رسولاں نے بستر پہ کراہتے ہوئے بنی کو قریب بلایا۔

''دھی کسی گھر سے انڈے کا پتا کر، شاید مل جائے، پیسے تو نہیں ورنہ دکان سے منگواتی''

کوئی چیز مانگنے کا تجربہ ابھی تک بنی کو نہیں ہوا تھا، ماں کو دوسرے گھروں سے چیز اُدھار لیتے اُس نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا، کئی خدشات کو بغل میں لے کر وہ ساتھ والے گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ اس گھر کا دسویں کا طالب علم ماجھا گزرنے

لگا تو باچھیں کھل گئیں جیسے کسی نے پلیٹ میں رکھ کر لڈو پیش کر دیا ہو۔

”او، او یہ چاند کہاں سے نکل آیا؟ ست بسم اللہ، جی آیاں نوں، حکم ہو“

ماجھے کی بدتمیزی نے بنّی کو ماں کی بیماری ہی بھلا دی وہ الٹے پاؤں گھر کی طرف بھاگی، گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کی ہائے ہائے پھر کان میں گونجنے لگی۔

”ہائے ہائے...... نی بنّی کسی گھر سے انڈے کا پتا کر دھی، میرے وجود میں سردی اُتر گئی، ہائے...... ہائے...... دھیان سے بنّی دھی، تو بچی نہیں اب“

بنّی ماں سے قدرے دور خیالات سے لڑ رہی تھی۔ وہ ماں کو ہائے ہائے کرتے کروٹیں بدلتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اُس نے وہیں سے ماں کو کروٹ بدلتے دیکھا۔ ان گنت خدشات یکدم معصوم سوچوں کو کچل سے گئے۔

”میں...... م...... ماں کو کچھ ہو گیا تو...... نجو...... میں...... ک...... میں...... نہیں...... نہیں۔ اللہ میری اماں ٹھیک......“

بنّی کی آنکھیں پانی کا بوجھ نہ برداشت کر پائیں۔ وہ ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرتی گلی کی دوسری جانب سبزی فروش پھجے کے گھر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔ قدم تھے کہ اٹھائے نہ اُٹھتے۔ ایک بار پھر غربت، غربت ہی کے دروازے پر کھڑی تھی۔ گھر میں بیٹی ادھیڑ عمر نیجاں نے دور سے ہی آڑے ہاتھوں لیا۔

”بنّی کیسے پیر پہ پیر رکھتی آ رہی ہے، کیا ہو گیا اب؟“

”اماں بیمار ہے۔ دوا کے پیسے نہیں......“

”تو یہاں کیا بینک ہے؟“

”نہیں، نہیں پیسے نہیں مانگ رہی، کوئی انڈا پڑا ہے تو...... اماں کو دینا ہے سردی ہو گئی اماں کو“

”پاگل کہیں کی انڈے دکانوں سے ملتے ہیں، جا بھاگ وہاں سے لے“

نیجاں کی کڑوی اور تلخ باتوں نے بنّی کی زبان ہی گنگ کر دی۔ وہ ماں کے پاس یوں لوٹی جیسے ماں کی مجرم ہو، مجبوری، مجبوری کے سرہانے رو رہی تھی۔

”اماں انڈا نہیں ملا، لیکن ماسی نیجاں تو......“

”کوئی بات نہیں پتر، نیجاں ہے ہی ایسی۔ ہر مزاج کا بندہ ہوتا ہے، ہائے میرا سینہ، بندے کو نبھا کرنا چاہیے۔ کوئی بات نہیں دھی، انڈا نہیں ملا تو“

رات بچیاں بے فکر سوئی تھیں کہ رسولاں کی کھانسی اور ہائے ہائے نے ایک دو بار جگا دیا، اور پھر کسی وقت رسولاں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ بنّی نے سکول جانا تھا، صبح جلدی اُٹھی ماں کو جگایا۔

”اماں! اماں ناشتہ بنا دو، سکول سے دیر ہو جائے گی“

ماں کی جانب مکمل خاموشی تھی، بنی نے جگانے کے لیے ہاتھ لگایا تو رسولاں کے بے حس و حرکت بدن نے بنی پر قیامت ڈھا دی۔ بنی کی چیخ اور دھاڑ پر نجو ہڑبڑا کر اٹھی، بھاگ کر ماں کی چھاتی سے آلپٹی، 'اماں، اماں، لیکن اماں بیگانگی کی چادر اوڑھ چکی تھی۔ دونوں بہنوں کی چیخ و پکار نے ہمسائیوں کی توجہ ادھر دلائی اور پھر رفتہ رفتہ اس کچی حویلی میں کچی حویلیوں کے مکین جمع ہونے لگے، کوئی نجو اور بنی کے سر پر ہاتھ رکھتا، کوئی اظہار ہمدردی سے دہرا ہو جاتا، کبھی کوئی بڑھیا نجو اور بنی کو آغوش میں لے کر بین کرنے لگتی۔ لیکن سراسیمگی اور چپ برابر دھاڑتی رہی۔

رسولاں کی لاوارث ان کھلی معصوم کلیوں پر حساس نظریں پڑتیں تو کچے گھر ان کا صحن چیخوں سے بھر جاتا۔ کلیجے پھٹنے کو آجاتے کچھ دیر بعد دوبارہ چپ قابض ہو جاتی۔ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ دوپہر تک رسولاں کی میت کی تجہیز و تکفین عمل میں آچکی تھی۔ اول تو رسولاں کا رشتہ دار کوئی تھا ہی نہیں اگر کوئی تھا بھی تو رسولاں کی حالت سے بھی ابتر تھا۔ ان یتیموں کو گلے کون لگاتا۔ بنی، نجو کو آغوش میں لیے تقدیر پر آنسو بہا رہی تھی۔ جس گھر میں رسولاں زندگی میں ملازمت کرتی تھی۔ وہ بیگم صاحبہ لمبی سی چمکیلی کار پہ آئی، آتے ہی پیڑھی پہ براجمان ہو گئی۔ کار سے گرم گرم روٹیاں، قورمے اور بریانی کی اشتہا آمیز خوشبو نے وہاں پہ موجود افراد کی توجہ ادھر کر لی۔ بیگم صاحبہ بنی اور نجو کو اپنے پاس بٹھا کر رسولاں کے گن گانے لگی۔ بیگم صاحبہ کی ایک ملازمہ بنی اور نجو کے آگے کھانا چننے لگی۔ کہ ایک طرف سے پُر درد آواز آئی۔

''دھی رانی، کمرے میں چلی جاؤ، کھانا یوں سب کے روبرو نہیں کھاتے۔''

بیگم صاحبہ کی ملازمہ کشتی میں روٹیاں اور سالن کا ڈونگا اٹھا کر کچے سے کمرے میں لے گئی بیگم صاحبہ نے بنی کو اشارے سے کمرے میں بھیج دیا۔ نجو نے روٹیوں، بریانی اور قورمے سے بھرے ڈونگے کو دیکھ کر بڑی حسرت بھری نظر سے بنی کو دیکھا۔

''بنی مرنے کے بعد اچھے اچھے کھانے لوگ دیتے ہیں نا''

''ہش چپ!''

بنی نے آہستہ سے نجو کو چپ کرایا لیکن معصوم تو معصوم ہوتا ہے۔

''مرنے کے بعد لوگ اچھے اچھے کھانے کیوں دیتے ہیں زندگی میں کیوں نہیں دیتے، اماں کو تو بیگم صاحبہ نے باسی روٹیاں نہیں دی تھیں اور اب''

''رحم دلی کے لیے، اب نہ بولنا''

بنی نے نجو کے آگے کھانا سرکایا پھر اسے گود میں لے کر رونے لگی۔

☆☆☆☆☆

ٹھنڈا جہنم

عجیب سی لڑکی تھی آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں کی عینک لگائے پہلی نظر میں کولھو کا بیل معلوم ہوتی تھی نہ جانے اتنی پرانی تشبیہ میرے ذہن میں کیوں آئی حالانکہ اُس کا چہرہ دلکش تھا مگر لباس اس قدر بے ڈھنگا، عورتیں بُرا نہ مانیں مردخانہ ہوں کا اشتہار معلوم ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ہونق نظر آئے۔ لباس کے معاملے میں اس قدر لاپرواہ میں نے یہی ماڈرن لڑکی دیکھی، جس پر اگر جدید فیشن کا لیبل چسپاں نہ ہوتا تو مبالغہ مجھے یہ کہنے میں قطعی باک نہ ہوتا کہ اس بھکارن نے تو بڑے ٹھسے کا لباس پہن رکھا ہے۔

میں نے شاہد کو کہنی مارتے ہوئے کہا

شاہد! یار یہ لڑکی ہے یا درمیانی نسل

شاہد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

عجیب گھامڑ آدمی ہو کیا تم نے لڑکی نہیں دیکھی یا ایسا لباس نہیں دیکھا۔

میں نے کہا بھائی لڑکیاں بھی دیکھی ہیں مگر ایسا لباس شاید نہیں دیکھا۔ لڑکیاں تو کلر میچنگ میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ ہاں البتہ اس چہرے میں کچھ عیب سی بات ہے جس نے اُس کی جزئیات تک کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے ہائی ہیل پہنے وہ سب میں نمایاں لگ رہی تھی کہ اچانک تیزی سے گزرتا ہوا ایک شخص اُس سے ٹکرایا اور وہ توازن قائم نہ رکھ سکی اپنے آپ کو سنبھالتے سنبھالتے وہ بھی لڑکھڑا گئی۔ میں اُس وقت اُس کے بالکل قریب تھا فوری طور پر اُسے سنبھلنے میں مدد دی۔ لمحے دو لمحے کا یہ قُرب یوں لگتا تھا جیسے برسوں پر محیط ہو گیا ہے۔ اُس نے بڑے بڑے شیشوں والی عینک اُتار کر میری طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر اُبھرا اور فوراً ہی ڈوب گیا۔ جیسے چاند کسی جھیل میں اُترے اور کنکر مارنے پر پارہ پارہ ہو جائے۔ اُس ایک لمحہ کو میں کیا نام دوں۔ میں نے محسوس

اقبال خان یوسف زئی

کیا یہ وہ لڑکی تو نہیں جسے میں نے سہارا دینے میں مدد دی تھی یہ تو نہ جانے کس سیارے سے آئی ہے اور اب اُسے پچھتاوا لگ رہا ہے کہ وہ کیوں اس زمین پر آئی۔ اُس کی زبان سے صرف ''تھینک یو'' نکلا اور وہ سینما ہال کی طرف بڑھ گئی۔

دراصل سائین پلیکس سینما میں پکچر کا پروگرام میری کزن نے بنایا تھا ٹکٹ بھی ایڈوانس میں حاصل کر لیے گئے تھے مگر عین وقت پر اُس کی ایک دیرینہ دوست آ گئی اور اُس نے فلم دیکھنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ میں نے اپنے دوست شاہد کو ساتھ لیا اور سینما ہال پہنچ گیا۔

میں شاہد سے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر شاہد وہ کسی اور ہی مشاہدے میں مصروف تھا ویسا ہی مشاہدہ جو عام طور پر ہمارے ہاں سڑک پر چلتے ہوئے سینما ہال میں اور اسی طرح کی اور جگہوں پر کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ایک خوبصورت لڑکی پر نظریں جماتے ہوئے ایک زوردار ہوں کہی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا بولا یار! تم نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے نہ زوردار۔ میں نے سرسری نظر اُس پر ڈال کر کہا۔ کیا تم نے اُس کے ابا جان کو بھی دیکھا۔

شاہد نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ یار یہ خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ ابا جان کیوں ہوتے ہیں میں اتنی فضول بات کا کیا جواب دیتا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

شاہد وہ لڑکی میرے حواس پر چھا گئی ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے جیسے میں نے جھنجھلا کر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔ شاہد کو شاید مجھ سے ایسے حملے کی توقع نہ تھی اُس نے سینما ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری جانب غور سے دیکھا اور خاموشی سے ہال میں داخل ہو گیا۔ میں اُس کے ساتھ چل تو رہا تھا مگر بالکل ساکت و صامت اُسی کارٹون سی لڑکی کے برابر ہمیں جگہ ملی جو سر جھکائے اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی ہم سے اگلی قطار میں وہی خوبصورت لڑکی معہ اپنے ڈیڈی کے براجمان تھی جسے شاہد بڑی خوبصورتی سے اپنی آنکھوں میں بٹھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ناکام یوں کہ لڑکی کی پشت ہماری جانب تھی اور سیٹ پر بیٹھا ہوا شاہد کبھی دائیں جھکتا کبھی بائیں۔

میں نے اُس کارٹون سی لڑکی کی طرف دیکھا جو غصیلے لہجے میں شاہد سے کہہ رہی تھی

کیا آپ کے پیٹ میں درد ہے؟

میں نے ہنسی کو دباتے ہوئے کہا

بھائی! اگر مار ہی پٹوانی ہے تو سینما سے باہر بھی یہ نیک کام انجام دیا جا سکتا ہے

خوبصورت سی لڑکی اور اس کے ڈیڈی نے گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا

شازیہ! تم ___ کیا بات ہے؟

جی! آپ __ جی ممی کچھ نہیں
اُس کی آواز سے لگتا تھا جیسے اُس نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے جی ممی کہا ہے
اپنی ممی اور ڈیڈی کو دیکھ کر جنہیں ہم باپ بیٹی سمجھ رہے تھے میں نے دیکھا اُس کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے کافی روشن روشن سا تھا بجلی کے قمقمے کی طرح بجھ گیا تھا۔ ہال کی روشنیاں بجھ گئی تھیں مگر ایک کرب میں اُس کے چہرے پر اندھیرے میں بھی محسوس کر رہا تھا۔
نیلے رنگ کی قیمتی سپورٹ کار کو شوختم ہونے کے بعد اُس نے جس تیزی سے سینما سے نکالا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی ستارہ جو اپنے وجود کو فضا میں قائم نہ رکھ سکا ہو ٹوٹ گیا ہے۔
اتنی عالیشان عمارت جس کا ہر کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ عمارت کیا تھی محل تھا۔ ساگوان کے بڑے دروازے سے میں اندر داخل ہوا۔ دروازے سے لے کر ویٹنگ روم تک جو دروازے سے کافی فاصلے پر تھا سُرخ رنگ کا انتہائی لمبا دبیز قالین بچھا ہوا تھا جسے میں نے فلموں میں تو دیکھا تھا مگر عام زندگی میں کبھی نہیں۔ چھو کر بھی نہیں مستقبل کی بہتر اُمیدوں کے ساتھ میں جانے کیا کیا سوچتا ہوا فوم کے صوفے میں دھنس گیا دو گھنٹے کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد جب میں اُس "محل" سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ امید تھی کہ اب سانس لینے کا دھندہ بہتر طور پر چل جائے گا میں نے اپنے آپ پر ہنستے ہوئے سوچا "محل" کے کونے میں میرے آقا کا دفتر تھا جو اس خوبی سے بنایا گیا تھا کہ وہ اس محل نما عمارت کا حصہ بھی لگے اور اُس سے الگ بھی ہو۔ گھر کے ملازمین کا دفتری حصہ میں آنا منع تھا اسی طرح دفتری سٹاف کو بھی رہائشی حصہ کی طرف جانے کی ممانعت تھی یوں بھی اُن کے آنے جانے کا راستہ قطعی علیحدہ تھا کاروبار کے سلسلے میں خانزادہ ایوب کا زیادہ وقت ملک سے باہر ہی گزرتا تھا میرے ذمہ دفتری ذمہ داریوں کے ساتھ ڈاک کا انتظام بھی تھا مختلف ممالک سے آئی ہوئی ڈاک کو قرینے سے کھولنا اور خانزادہ ایوب کے کمرے میں رکھ دینا۔
کافی دنوں کے بعد ایک شام مجھے شازیہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ارب پتی باپ کی بیٹی پنجوں کے بل ننگے پاؤں پائیں باغ میں غالباً ورزش کر رہی تھی۔ وہی بے ڈھنگا سا لباس دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے وہ اپنے جسم کو کبھی دائیں طرف جھکاتی کبھی بائیں طرف
میں نے پوچھا __ کیا آپ کے پیٹ میں درد ہے؟
اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا پھر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلکیاں نمودار ہوئیں
اوہ آپ __!
آپ کو کیا تکلیف ہے اُس نے خوش دلی اور قدرے اکتاہٹ سے پوچھا

کچھ نہیں۔ یونہی سوچا آپ سے ورزش کے فوائد ہی پوچھ لوں
ضرور پوچھیے اُس نے گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا
خالی خولی نگاہوں سے شازیہ نے میری طرف دیکھا
مگر آپ یہاں کہاں؟
میں نے کہا آپ کے ڈیڈی نے مجھے ملازم رکھ لیا ہے۔
''ڈیڈی''___ اُس کی آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا۔ ایسا کرب جو زخمی ہرنی کی آنکھوں میں ہوتا ہے، جو موت کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ آہستہ آہستہ وہ اجنبی اجنبی سی ملاقاتیں شناسائی میں بدلنے لگیں۔
ایک روز میں نے شازیہ سے کہا
شازیہ! آؤ کہیں چلیں
کھوئے کھوئے سے انداز میں اُس نے میری طرف دیکھا۔
مجھے کہاں لے کر جاؤ گے اندھیرا تو اُجالے کو ہڑپ کر لیتا ہے۔
شازیہ عجیب لڑکی تھی اُکتائی اُکتائی بیزار بیزار۔ گرمیاں ہیں تو سارا سارا دن اپنی سپورٹ کار میں بے مقصد پٹرول پھونک رہی ہے سردیاں ہیں تو دونوں ہاتھ بغل میں دبائے پیدل چلا کرتی۔ کبھی کبھی میں اُس کے ساتھ ہو لیتا۔ اوٹ پٹانگ لباس پہنتا تو گویا اُس کا مشغلہ تھا میں اُسے سمجھاتا شازیہ تم کم از کم گرم کپڑے تو پہن لیا کرو۔
اچھا! ضرور پہنوں گی کہہ کر پھر ٹھنڈے کپڑوں میں نکل جاتی کبھی ہفتوں کمرہ میں بند جانے کیا کیا کرتی کا کیا کچھ سوچتی۔ کچھ پوچھتا تو بگڑ جاتی ایک دن میں نے قدرے سختی سے کہا۔ دیکھو شازیہ اگر تم نے ڈھنگ کے کپڑے نہ پہنے تو میری اور تمھاری دوستی ختم۔
دوسرے دن وہ ڈھنگ کے لباس میں تھی میں تعریف میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی دیکھ کر میرا دل دہل گیا میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ایک دن ڈاک کھولتے ہوئے اُس کے نام کا لفافہ آیا مجھ سے رہا نہ گیا نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ازراہ تجسس اُسے کھول کر دیکھ لیا مگر مجھے مایوسی ہوئی شازیہ کے ایک کزن محرم نے اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا میں نے وہ لفافہ شازیہ کو دے دیا اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اُسے کھولا دیکھا معلوم ہوتا تھا ابھی چیخ مار کر رو پڑے گی۔
شام کو جب وہ ملی اُس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید تھا۔ میں نے بے حد اصرار کیا تو کہنے لگی
شکیل! آج وہ ستارہ ٹوٹ گیا جو اپنے وجود کو فضا میں قائم رکھے ہوئے تھا۔ میں آج بالکل ٹوٹ گئی ہوں بکھر گئی ہوں۔ میں اُس دن بھی کھو گئی تھی بکھر گئی تھی جب میری ممی کے___

مرنے کے بعد میرے ڈیڈی نے دوسری شادی کی۔
تم پوچھا کرتے تھے نہ کہ شازیہ اربوں کی جائیداد کی تم وارث ہو اتنے بڑے "محل" میں رہتی ہو جس کا ہر کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے دنیا کی کونسی ایسی آسائش ہے جو تمھیں حاصل نہیں پھر بھی تم خوش نہیں۔
شکیل! یہ تو ٹھنڈا جہنم ہے اُس نے ڈوبتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔
اتنے بڑے محل میں کوئی کسی کا نہیں یہاں سب تنہا ہیں۔ ممی کا دکھ یہ ہے کہ اُن کے غریب ماں باپ نے اُن کی جوانی کو بڑھاپے کی چتا میں ڈالدیا اور وہ اس محل کا ایندھن بن کر رہ گئیں ڈیڈی کا دکھ یہ ہے کہ میں سرکش ہوں باغی ہوں میں نے اُن کی کبھی کوئی بات نہیں مانی۔ لیکن شکیل! ڈیڈی نے کبھی ڈیڈی بن کر شازیہ کو نہیں پکارا وہ اپنے کاروبار میں اتنے اُلجھے رہتے ہیں کہ انھیں نہ میرے بچپن سے سروکار رہا نہ اب جوان ہونے پر میں ان کی نظر میں کوئی مقام حاصل کر سکی۔ ماں ایک حادثے میں مجھ سے تو عمری میں ہی جدا ہو گئی۔ ایک تنہا لڑکی اپنی تنہائی میں گم ہو گئی۔ تنہائی تو انسان کو کھا جاتی ہے نہ کاش ڈیڈی ایک بار ہی پیارے سے شازیہ کہہ کر پکارتے تو نفرت اور اُکتاہٹ کا جہنم جو میرے دل میں ہے ٹھنڈا پڑ جاتا۔ پھر تم ہمیشہ مجھے ڈھنگ کے لباس میں دیکھتے۔ زندگی کی ہر خوشی کا عکس میرے چہرے پر ہوتا۔ میں بھی اوروں کی طرح ناچتی گاتی زندگی کا لُطف اُٹھاتی۔ میں نے چاہا تھا خرم مجھے اپنا لے میں نے اس کی آرزو کو برسوں اپنے دل کا خون دے دے کر جوان کیا تھا کہ شاید وہ آجائے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے لیکن شکیل کیا ضروری ہے کہ آدمی جس سے محبت کرے اُس سے اظہار محبت بھی کرے۔ محبت تو خود کو منوا لیتی ہے جیسے مجھے یہ معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اگرچہ تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔
آدمی اندر سے ٹوٹ جائے تو کوئی منظر، خوش منظر کوئی کونپل، سرسبز اور کوئی لذت سکون نہیں دیتی باہر چراغاں بھی ہو تو دل کے اندھیرے کو دور نہیں کر سکتا۔ گلشن گلشن صحرا بن جاتے ہیں جہاں ریت کے بگولے اُڑتے پھر رہے ہوں کبھی یہاں کبھی وہاں۔ شہروں کی رونق بھی لاحاصل۔ سمندروں کی وسعت بھی بے معنی موجوں کی بلندی بھی رائیگاں۔
اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے میں زمین تھا وہ آسمان تھی جو حدِ افق پر ملتے تو نظر آتے ہیں مگر ملتے نہیں یا دریا کے دو کنارے تھے جس پر حدِ نگاہ بس کہیں خطِ اتصال کا شائبہ گزرتا ہے اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کہیں نہیں ملتے کبھی نہیں ملتے اس لیے میں اُس ٹھنڈے جہنم سے نکل کر اپنے جہنم میں آ گیا ہوں۔

☆☆☆☆☆

نیلی سائیکل

انعام الحسن کاشمیری

یہ بھید مجھ پر پورے چالیس برس بعد کھلا جب میں نے اپنے بیٹے کی خواہش پر اُسے سائیکل دلوائی۔ ولید کی خواہش تھی کہ میں اِسے سرخ رنگ کی دو ٹائروں والی سائیکل خریدوں لیکن میں نے اُس کی خواہش کا احترام کرنا ضروری نہیں سمجھا اور اِس کی تمنا پوری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بچپن کی ادھوری خواہش پورا کرنے کی بھی کوشش کی اور سرخ کے بجائے نیلے رنگ کی سائیکل خرید دی۔ اس خواہش کی تکمیل میں گو مجھے پورے چالیس برس لگے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ مجھ پر ایک ایسا بھید بھی آشکار ہو گیا جو اگر ولید سائیکل کی خواہش کا اظہار نہ کرتا تو مجھے اس کے بارے میں ہرگز معلوم نہ ہو پاتا جس کا سامنا میں نے چالیس برس قبل کیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے پہلی کھلونا گاڑی خریدی۔ یہ سفید رنگ کی پیجارو گاڑی تھی جس کے چاروں دروازے کھلتے تھے۔ اس گاڑی کو پیچھے کی جانب دبا کر دھکیلنے کے بعد جب چھوڑا جاتا تو یہ شوں کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ چلتی۔ اِسے میں نے والدہ کے ساتھ بازار سے خریدا تھا جہاں وہ اپنی خریداری کے لیے مجھے ساتھ لے گئی تھیں۔ تب شاید میری عمر چار برس

کے لگ بھگ تھی اور کھلونوں کی ایک دکان پر میں نے ضد باندھ لی تھی کہ مجھے یہ گاڑی خریدنا ہے۔ والدہ کی کوشش تھی میں پلاسٹک کا کوئی کھلونا خرید لوں لیکن میرا دل اس سفید گاڑی پر آ گیا تھا اور میں اِسے خریدے بغیر کسی صورت ٹلنے پر تیار نہ تھا چناں چہ والدہ نے میرے اصرار کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے مجھے یہ گاڑی دلوا دی۔ مجھے معلوم تھا میرے کتنے اصرار اور ضد کے بعد والدہ نے یہ گاڑی دلوائی ہے اس لیے اِسے محفوظ رکھنا اور خراب ہونے سے بچانا میری اولین ترجیح تھی۔ میں دوسرے بچوں کو اِسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا تھا کہ مبادا کوئی خراب کر دے۔ خود کھیلنے کے بعد اِسے پانی والے ایئر کولر میں چھپا دیا کرتا تھا جو اُن دنوں سردیاں ہونے کے باعث قابل استعمال نہیں تھا اور صحن کے ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔ اس ایئر کولر کے اندرونی حصے میں چند غیر استعمال شدہ چیزوں کا کباڑ جمع تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنا ننھا سا کھلونا اس میں چھپانے میں بڑی سہولت تھی۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی لیکن وہ اتنا چھوٹی تھی کہ کولر کے اندر ہاتھ ڈال کر گاڑی کو نکال نہیں سکتی تھی اس لیے میں اُس کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ البتہ مجھے پڑوس کے بچوں کی فکر ہمہ وقت دامن گیر رہتی تھی۔ وہ والدہ سے قرآن پاک پڑھنے کے لیے ہمارے

گھر آیا کرتے تھے اور میں ڈرتا تھا کہ میری عدم موجودگی میں کوئی بچہ روم ایئر کولر سے گاڑی چرا لے۔ جب تک بچے پڑھتے رہتے میں ارد گرد ٹہلتا رہتا اور اگر کوئی بچہ کولر سے کچھ فاصلے پر نصب نل پر پانی پینے کے لیے جاتا تو میں اُس پر گہری نظر رکھتا۔ اگرچہ تب میں صرف چار برس کا تھا لیکن مجھ میں اپنی چیزوں اور خاص طور پر کھلونوں کو دوسرے بچوں کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھنے کا احساس بخوبی موجود تھا۔ میں کنجوس یا بخیل ہرگز نہ تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اپنے کسی قیمتی کھلونے کو یوں سنبھال کر رکھنے کا جنون تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ تب ایسے قیمتی کھلونے شاذ ہی بچوں کو نصیب ہوتے تھے اور پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں چونکہ ایک دفعہ رو رو کر ہلکان ہوتے ہوئے والدہ کو یہ قیمتی کھلونا دلانے پر راضی کر چکا ہوں اس لیے وہ آئندہ مجھے کبھی اپنے ساتھ بازار لے کر نہیں جائیں گی جو ہمارے گھر سے خاصا دور تھا۔ گلی کے باہر سڑک پر اکا دکا دکانیں تھیں جن میں زیادہ تر کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ میں اِن دکانوں سے ٹافیاں اور چوتھم خرید کر خود بھی کھاتا اور اپنے ہم جولیوں کو بھی دیا کرتا لیکن انھیں اپنی گاڑی سے ہمیشہ دور رکھتا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ میں کنجوس اور بخیل نہ تھا۔ ایسا ہوتا تو میں

ہم جولیوں کو اپنی کھانے پینے کی چیزوں سے بھی دور رکھتا۔

کچھ بڑا ہونے پر، جب میں پانچ برس کا ہو گیا تو والد صاحب نے مجھے سکول میں داخل کروا دیا۔ یہ قاعدہ جماعت تھی جسے میں نے چند روز ہی میں پڑھ لیا اور اس لائق ہو گیا کہ اول جماعت میں بیٹھ سکوں۔ سمن آباد میں المتاز سینما سے متصل گلی میں تنویر پرائمری سکول تھا جہاں ہم ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے اور ہماری استانیاں لکڑی اور بید کی بنی کرسیوں پر براجمان ہمیں پڑھانے سے زیادہ اپنی باتوں میں مشغول رہتیں۔ ان میں ایک صورت مجھے اب بھی یاد ہے۔ یہ ایک فربہی مائل استانی تھیں جن کا قد درمیانہ اور چہرہ موٹا تھا۔ ناک کی نوک پر ایک عینک ہر وقت سجی رہتی۔ ایک بیگ بھی ان کے کاندھوں پر ہمیشہ دھرا رہتا اور جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھتیں تو بیگ کو اپنی گود میں رکھ لیتیں۔ یہ چھوٹا سا سکول تھا جس میں ہم لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اول جماعت پاس کی تھی یا نہیں کہ والد صاحب نے مجھے وہاں سے اٹھا کر قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے سمن آباد سے متصل اتحاد کالونی کے ایک مدرسہ میں داخل کروا دیا۔ میں قرآن پاک ناظرہ پڑھ لیتا تھا اور آخری پارے کی چند چھوٹی سورتیں بھی یاد کر چکا تھا۔ مدرسہ میں میرے جیسے کئی بچے زیرِ تعلیم تھے جن کی اکثریت یا شاید سب کے سب مدرسہ ہی میں رہائش پذیر تھے۔ میں دوپہر کو گھر چلا آیا کرتا تھا۔ چند دن مدرسہ میں اچھے گزرے لیکن پھر میرا دل اوبھ گیا۔ قاری صاحب کی شفقت، محبت اور پھر مار بھی مجھے راہ راست پر نہ لا سکی اور میں دورانِ سبق چھپ کر نکل جایا کرتا۔ کلاس میں جہاں میں بیٹھتا تھا وہ جگہ دروازے کے بالکل سامنے تھی چناں چہ میں باہر سے گزرنے والے لوگوں کو دیکھا کرتا اور ان کی آزاد زندگی پر رشک کرتا۔ ایک دن میں مدرسہ سے بھاگا تو سیدھا گھر جانے کے بجائے اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا۔ والد صاحب کو میری ان حرکتوں کی اطلاع مل چکی تھی اس لیے جوں ہی گھر پہنچا، میری خوب ٹھکائی ہوئی۔ اب میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی صورت مدرسہ نہیں جاؤں گا جہاں سارا دن قید میں رہنا پڑتا ہے۔ دراصل میں سکول کے ماحول کا خوگر ہو گیا تھا جہاں ہم لڑکے اور لڑکیاں سارا دن پڑھائی سے زیادہ اوٹ پٹانگ حرکتوں میں گزار دیتے۔ نیکر اور سفید شرٹ پہنے ہم آدھی چھٹی کے وقت سکول میں سے غائب ہو جاتے اور گھوم پھر کر پوری چھٹی کے وقت سکول میں واپس آتے تاکہ گھر جانے کے لیے اپنے اپنے بستے اٹھا لیں۔

اگلی صبح والد صاحب کا موڈ بہتر ہو گیا۔ انہوں نے پیار سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ بازوؤں والی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے جس کی بنائی بید سے کی گئی تھی۔

اس جیسی چار کرسیاں آج بھی میرے گھر میں موجود ہیں۔ والد نے میری کلائیوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما اور مجھے جھولا جھولاتے ہوئے پوچھنے لگے کہ مجھے مدرسہ میں پڑھنا ہے یا واپس سکول میں داخل ہونا ہے۔ میں نے سکول کا نام لیا تو والد نے وعدہ لیا کہ میں وہاں مدرسہ والی حرکتیں نہیں کروں گا اور دل لگا کر پڑھوں گا۔ چناں چہ اگلے روز مجھے دوبارہ پہلے والے سکول میں ہی داخل کرا دیا گیا جہاں آنے کے بعد میں مدرسہ کو اور والد صاحب سے کیا ہوا وعدہ بھول گیا اور حسب سابق اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا جو میرے ہم جولیوں اور ہم جماعت لڑکے اور لڑکیوں کا وتیرہ تھیں۔

کچھ دن بعد والد صاحب کو اطلاع ملی کہ میں پڑھائی پر دھیان نہیں دیتا اور سارا وقت شرارتیں کرنے میں گزار دیتا ہوں۔ والد صاحب سخت مزاج اور غصیلا ہونے کے باوجود مجھ پر نہیں برسے بلکہ انھوں نے مجھے چند کھلونے لا دیے۔ سکول سے واپسی پر میں کھلونوں کے ساتھ کھیلنے میں منہمک ہو جاتا اور اس طرح گھر سے باہر جانے کا میرا راستہ مسدود کر دیا گیا۔ وہ ہر کچھ دنوں کے بعد کوئی نیا کھلونا لے آتے۔ یہ کھلونے مہنگے اور پیچیدہ قسم کے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے مجھے ان کے ساتھ کھیلنے میں اگرچہ کوئی زیادہ لطف محسوس نہ ہوتا لیکن اس کے باوجود شام تک میرا وقت اچھا گزر جاتا۔

دوسری جماعت میں تھا تو میرے ایک ہم جولی کے والد نے اُسے سائیکل خرید دی۔ یہ نیلے رنگ کی ایک خوبصورت سائیکل تھی جس کے پچھلے پہیے کے اطراف میں دو چھوٹے چھوٹے پہیے بھی نصب تھے جو درحقیقت سہارے کا کام کرتے تھے تا کہ ان چھوٹے پہیوں کی مدد سے سائیکل چلانا سیکھ لی جائے۔ میرا یہ دوست جب بھی میری گلی میں سائیکل لے کر آتا تو میں اسے ضرور چلاتا۔ دھیرے دھیرے میں سائیکل چلانے میں ماہر ہو گیا اور ایک دن موقع پا کر میں نے سائیکل کے اطراف میں نصب دونوں چھوٹے پہیے اتار کر چھپا دیے تا کہ میں آسانی کے ساتھ دو پہیوں پر سائیکل چلا سکوں۔ میرا ہم جولی میری اس حرکت سے بے خبر رہا لیکن اب وہ بھی اس قدر سیکھ چکا تھا کہ اُسے بھی ان حفاظتی پہیوں کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔ روزانہ ایک آدھ گھنٹہ تک سائیکل چلانے کی مشق کرنے کے نتیجے میں میں اس میں خوب ماہر ہو گیا اور بڑی جماعتوں کے لڑکوں کی سائیکلیں بھی چلانے لگا۔ میرے اس شوق نے مجھ میں خواہش بیدار کی کہ میری اپنی سائیکل ہونی چاہیے جس پر میں سکول آ جا سکوں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ایک دن والد صاحب سے کیا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا

مطالبہ سنتے ہی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ کچھ دیر تک تو گم سم رہے اور کچھ نہ بولے لیکن میرا مطالبہ کئی مرتبہ دہرائے جانے کے بعد انھوں نے فقط اتنا ہی کہا کہ اچھا خرید دوں گا۔ میں خوش ہوگیا اور اس امید پر دن گزارنے لگا کہ کچھ ہی روز میں والد صاحب مجھے نئی سائیکل خرید دیں گے۔
اب میں زیادہ بے فکری کے ساتھ ہم جولیوں کی سائیکل چلاتا اور انھیں بتاتا کہ چند روز میں میری اپنی سائیکل آجائے گی۔ میں نے جس سائیکل پر سب سے پہلے قدم جمائے وہ نیلے رنگ کی تھی اس لیے میں نے والد صاحب سے فرمائش کی تھی کہ میری سائیکل بھی نیلے ہی رنگ کی ہونی چاہیے۔
ایک مہینہ گزر گیا لیکن والد صاحب کی طرف سے سائیکل کی خریداری میں کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہ آئی تو میں نے انھیں یاددھانی کروائی۔ اِس بار بھی اگرچہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ حیران و پریشان نظروں سے میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے مجھے مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواب سوچ رہے ہیں۔ کچھ دن بعد جب میرے امتحانات قریب آئے تو والد صاحب نے وعدہ کیا کہ اگر میں نے کلاس میں پوزیشن لی تو وہ مجھے ضرور نیلے رنگ کی سائیکل خرید دیں گے۔ اب میں زیادہ شوق کے ساتھ سکول کے سبق پر دھیان دینے لگا اور جب میرا نتیجہ آیا تو میں نے جماعت میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ میں فطری طور پر ذہین تھا اور کلاس میں زیادہ توجہ نہ دینے کے باوجود امتحان میں نہایت شاندار مظاہرہ کرتا۔ نتیجے والے دن اگرچہ صبح سے دوپہر تک میری پریشانی انتہا پر رہی لیکن جب دوسری جماعت کا نتیجہ بولتے ہوئے میرا نام پکارا گیا تو میری خوشی دیدنی تھی۔ یہ خوشی اس لیے نہیں تھی کہ میں اول آیا ہوں بلکہ مجھے یقین تھا کہ والد صاحب میری فرمائش پوری کرتے ہوئے مجھے سائیکل خرید دیں گے۔ میں خوشی خوشی رزلٹ کارڈ تھامے گھر میں داخل ہوا اور بے چینی کے ساتھ والد صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ظہر کی نماز کے بعد وہ تشریف لائے تو دوڑتا ہوا ان کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر انھیں اپنے اول آنے کی اطلاع دی لیکن حیرت انگیز طور پر والد صاحب میری اس اطلاع پر زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ انھوں نے پیار سے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا اور پھر میرے ایک ہاتھ کو پکڑے اس کرسی پر براجمان ہوگئے جس پر وہ ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔
والد صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ رقصاں تھی جس میں کسی قدر پریشانی کا ہلکا سا عنصر بھی شامل تھا جسے میں سمجھ نہیں پایا۔ انھوں نے مجھے جھولا جھلاتے ہوئے پوچھا "اچھا تو میرا بیٹا سائیکل لے گا؟"

''جی جی---ابو جی مجھے سائیکل چاہیے- آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں جماعت میں اول آیا تو آپ مجھے سائیکل خرید دیں گے-اب لے دیں نا نیلے رنگ کی پیاری سی سائیکل!!'' میں نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا-

تب والد صاحب کچھ سوچنے لگے اور پھر ہامی بھرلی کہ وہ مجھے چند دن بعد سائیکل خرید دیں گے- میں مطمئن ہو کر اپنے کھیل کود میں مشغول ہو گیا- اگلے روز والد صاحب میرے لیے چابی سے چلنے والا ایک پیارا سا کھلونا لے آئے جسے پا کر میں بے حد خوش ہوا اور سائیکل کا پوچھنے کے بجائے اِس کھلونے کے ساتھ کھیلنے لگا- چند دن اسی طرح گزر گئے- پھر میں نے والد صاحب سے سائیکل کی بابت دریافت کیا تو وہ اقرار میں سر ہلاتے ہوئے باہر چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں پلاسٹک کے چند ایسے کھلونے تھے جن کے الگ الگ حصے تھے اور انھیں آپس میں جوڑ کر مختلف اشیاء بنائی جاتی تھیں جیسے ہوائی جہاز، گھر وغیرہ- یہ کھلونے مجھے بے حد اچھے لگے اور تب میں وقتی طور پر سائیکل کو بھول گیا- اسی طرح کافی دن بیت گئے - میں اپنے ہم جولیوں کی سائیکل چلا کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتا اور سوچتا کہ ایک دن والد صاحب مجھے بھی نیلے رنگ کی پیاری سی سائیکل دلا دیں گے جس کا انھوں نے وعدہ کر رکھا ہے- آخر میرے سالانہ امتحانات قریب آن پہنچے اور میں نے والد صاحب سے صاف کہہ دیا کہ اگر مجھے سائیکل نہ دلائی گئی تو میں اچھی طرح امتحان کی تیاری نہیں کروں گا- میری دھمکی پر والد صاحب ہنسنے لگے اور پھر مجھے گود میں بٹھاتے ہوئے سمجھانے لگے کہ تم اچھی طرح امتحان کی تیاری کرو اور پہلی جماعت کی طرح دوسری جماعت میں بھی اول پوزیشن لینا، میرا وعدہ ہے کہ میں تمھیں ضرور نیلی سائیکل خرید دوں گا- میں نے والد صاحب کے وعدے پر ایک بار پھر اعتبار کر لیا اور دن رات پڑھائی میں مصروف ہو گیا تا کہ اول پوزیشن لے سکوں- شومئی قسمت دوسری جماعت میں بھی میری اول پوزیشن رہی جس کی مجھے اور والدہ کو بے حد خوشی ہوئی- والد صاحب بھی اگرچہ مسرور ہوئے لیکن جب میں نے انھیں اپنا وعدہ یاد دلایا تو انھوں نے اگرچہ تب اس کے لیے فوری ہامی نہیں بھری لیکن انکار بھی نہیں کیا- وہ اِسی وقت باہر چلے گئے اور جب پلٹے تو ان کے ہاتھوں میں ڈھیر سارے کھلونے تھے جن میں نیلے رنگ کی ایک کار بھی تھی جو بیٹری سے چلتی تھی- اس کے نچلے حصے میں ایک بٹن نصب تھا جسے آن کرنے پر کار موسیقی کی آوازوں میں دھیرے دھیرے رینگنے لگتی اور پھر دائروں میں چلتے ہوئے دلچسپ نظارہ پیش کرتی-

میری الماری کھلونوں سے بھر گئی لیکن میری سائیکل نہ آئی۔ جب میں تیسری جماعت میں تھا تو والدصاحب مجھے سائیکل کے نقصانات کی بابت آگاہ کیا کرتے لیکن میں ان کی نصیحتیں ان سنی کر دیتا اور سائیکل کے لیے رونے لگ پڑتا۔ تیسری جماعت میں اگرچہ میں نے زیادہ دلچسپی سے نہیں پڑھا لیکن اس کے باوجود میری دوسری پوزیشن آگئی۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ والدصاحب مجھے ہرگز سائیکل خرید کر نہ دیں گے اس لیے میں نے اس کا مطالبہ کرنا بھی چھوڑ دیا تاہم سائیکل کی تمنا اور خواہش میرے دل میں بدستور موجود رہی۔ اب میں نے تہیہ کر لیا کہ پیسے جوڑ کر خود ہی سائیکل لے لوں گا۔ وقتی طور پر میں اپنے شوق کی تسکین کے لیے ہم جولیوں کی مدد حاصل کرتا یا پھر کرائے پر سائیکل لے لیتا۔ ایک دن کرائے پر لی گئی سائیکل کی بریک ٹوٹ گئی تو میں سیدھا بجلی کے کھمبے میں جا لگا۔ خوش قسمتی سے میرے کوئی چوٹ نہ آئی لیکن جب میں سائیکل کو سیدھا کر کے چلانے لگا تو پتا چلا اس کا ایک پیڈل ٹوٹ گیا ہے۔ میں گھبرا گیا لیکن تب ایک نیک دل شخص نے میری مدد کی اور کالے دھاگے سے اس کے ٹوٹے ہوئے پیڈل کو باندھ دیا اور ہدایت کی کہ میں اندھیرا چھانے کے بعد دکان پر سائیکل واپس کرنے جاؤں تاکہ دکاندار کی نظر اس کے ٹوٹے ہوئے پیڈل پر نہ پڑ سکے۔ اُس دن اگرچہ میں نے ڈرتے ڈرتے سائیکل دکان پر پہنچا دی لیکن بعد میں کرائے پر لینے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ میری ان ساری حرکتوں سے والدصاحب مکمل طور پر بے خبر تھے۔

مجھے والدصاحب سے ایک طرح کی نفرت ہو گئی۔ میں اکثر سوچتا رہتا کہ آخر وہ مجھے سستے داموں کوئی سائیکل خرید کیوں نہیں دیتے۔ کیا اُن کی نظر میں میری کوئی حیثیت یا وقعت نہیں۔ اب کبھی کبھی میں اپنی والدہ سے بھی اپنے اس رویے کا اظہار کر دیتا جسے سن کر وہ مسکرا دیتیں۔ میں نے اُن سے صاف کہہ رکھا تھا کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو ڈھیر سارے پیسے کما کر والدصاحب کو دوں گا تاکہ وہ مجھے آزاد کر دیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے والدہ سے پوچھا کہ ہر مہینے میرے کھانے پینے، کپڑوں، سکول کی فیس اور دیگر مدوں میں کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ والدہ نے حساب کر کے مجھے خرچ کا بتایا۔ تب میں نے سفید قلعی سے مزین کچن کی دیوار پر حساب لگا کر کچی پنسل سے لکھ دیا کہ تعلیم مکمل ہونے اور نوکری کے حصول تک مجھے کتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میری اس سوچ کا والدصاحب کو بھی علم ہو گیا اور وہ اکثر مجھ سے مذاق کرتے ہوئے پوچھتے "کیوں میاں صاحبزادے!

تم آزادی لینے کے لیے کتنے پیسے ادا کرو گے؟'' اور میں سپاٹ لہجے میں انھیں حساب لگا کر بتاتا کہ اتنے پیسے تب وہ اور زیادہ زور سے ہنسنے لگتے اور والدہ سے کہتے کہ دیکھو! صحیح حساب لگانے میں تم بھی اس کی مدد کرنا تاکہ کوئی غلطی نہ رہے، میں پورے پیسے لوں گا ایک روپیہ بھی کم نہیں۔'' ہر کچھ عرصے کے بعد میرے لگائے ہوئے تخمینے میں اور اضافہ ہو جاتا اور ایک روز تنگ آ کر میں نے حساب لگانا ہی چھوڑ دیا۔

میں پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا کہ دادا ابو بیمار ہو گئے جو ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤں میں جا بسے تھے۔ والد صاحب ہمیں گاؤں میں ان کے پاس چھوڑ آئے۔ گاؤں آ کر میں نے نئے سکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کے ماحول میں اگرچہ سائیکل خریدنے کی میری خواہش وقتی طور پر دب گئی لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی یہ خواہش دبی چنگاری کی طرح دھیرے دھیرے سلگنے لگتی اور میں سوچنے لگتا کہ دادا ابو کے ٹھیک ہوتے ہی جب ہم واپس شہر جائیں گے تو میں دوبارہ ڈھیر سارے پیسے جمع کر کے سائیکل خرید لوں گا۔

وقت کی اڑان اتنی سبک تھی کہ جب میں واپس شہر آیا تو میٹرک کا امتحان پاس کر چکا تھا اور اب میرا داخلہ کالج میں ہونا تھا۔ میں ویگن پر کالج جایا کرتا اور طالب علموں کو حاصل رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جیب خرچ کے لیے ملے پیسے جمع کر لیتا تاکہ ایک اچھی سی سائیکل خرید کر ویگن پر سفر کے جھنجھٹ سے خلاصی پا سکوں۔ گھر سے ویگن کا سٹاپ خاصا دور تھا اور اگر میرے پاس سائیکل ہوتی تو میں سٹاپ تک جانے کے وقت میں کالج کے آدھے راستے تک پہنچ جاتا۔ میں نے اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ اب والد صاحب سے کبھی کوئی چیز نہ مانگوں گا۔ میں ایسے ارادے کے ذریعے ان سے اپنے بچپن کی خواہش پوری نہ کرنے کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

کالج کے پہلے دو سال میں میں باوجود کوشش کے اس قدر پیسے جمع نہ کر پایا کہ نئے ماڈل کی اچھی سائیکل خرید سکوں۔

تیسرے سال میں ایک دن عجیب بات ہوئی۔ گھر میں ہم بہن بھائی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ والد صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک گفتگو ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ہنستے ہنستے مجھے مخاطب کیا اور بولے ''میں نے مکینک منظور سے بات کر لی ہے، کل تم اُس کے ساتھ مارکیٹ چلے جانا اور سیکنڈ ہینڈ اچھی سی موٹر سائیکل خرید لانا۔'' میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ والد صاحب مجھے سائیکل خرید کر دینے کے روادار نہ ہو رہے تھے تو اب بھلا وہ موٹر سائیکل کیونکر

دلائیں گے - چھوٹے بہن بھائی موٹر سائیکل کی آمد کا سن کر خوشی سے ناچنے لگے - میں والد صاحب کی بات کی حقیقت جاننے کے لیے سیدھا مستری منظور کی دکان پر پہنچا جو گلی کے نکڑ پر موٹر سائیکل ٹھیک کرنے کا کام کیا کرتا تھا- میں نے اس سے تصدیق کروائی اور تب میں زندگی میں پہلی بار حقیقی مسرت سے آشنا ہوا اور مجھے معلوم ہوا کہ خوشی کس طرح دل کے اندر سے پھوٹتی ہے اور جسم کے باقی اعضا اور آنکھوں سے اس کا اظہار کس طرح ہوتا ہے- ممکن ہے سکول کی ابتدائی جماعتوں میں مجھے ایسی خوشی سے آشنا ہونے کا موقع میسر آیا ہو لیکن تب میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے اصل خوشی کا کوئی ادراک نہ تھا- تب تو میں ننھے منے کھلونے اور گولیاں ٹافیاں ملنے پر بھی بے حد خوش ہو جایا کرتا تھا-

اگلے دن میں لاہور ہوٹل کے نیچے واقع مارکیٹ میں سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لایا- مجھے چونکہ سائیکل چلانے کی مہارت تھی اس لیے میں ایک دو دن میں ہی موٹر سائیکل چلانا بھی سیکھ گیا- لیکن اس کے باوجود میرے دل میں سائیکل کی کسک موجود رہی جو اگرچہ موٹر سائیکل آنے کے بعد تحت الشعور کے کسی کونے میں جا دبکی لیکن پھر بھی جب کبھی میں کسی بچے کے پاس سائیکل دیکھتا تو یہ احساس فوراً میرے تحت الشعور سے پھدک کر میرے شعور میں پہنچ جاتا اور مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ یہ بچہ کتنا خوش قسمت ہے جس کے پاس سائیکل ہے- ایک میں بھی تھا جو سائیکل کی تمنا میں ہر برس خوب دل لگا کر پڑھتا تا کہ کلاس میں اول آئے اور جب اول آتا تو اِسے اگلے سال پر ٹرخا دیا جاتا-

---

ولید کو سائیکل خرید کر دینے میں بھی اگرچہ والد صاحب نے مخالفت کی لیکن میں نے ٹھان لیا تھا کہ ولید کی ننھی ننھی خواہشیں پوری کر کے اپنی تشنہ خواہشوں کی تسکین کا سامان کیا کروں گا چناں چہ جب اُس نے سائیکل لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں فوری طور پر اُس کے لیے نیلے رنگ کی ایک سائیکل لے آیا جسے وہ گرتا پڑتا چلاتا اور اُس کے روپ میں میں خود کو اِس ننھی سی سائیکل پر بیٹھا دیکھ کر خوب خوش ہوتا- مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اپنے بیٹے ولید سے زیادہ میں خوش ہوں-

ایک دن ولید نے سائیکل ٹھیک طرح چلانا سیکھ لی اور تب وہ اِسے باہر سڑک پر لے گیا اور پھر چلاتے ہوئے نا جانے کہاں نکل گیا- کافی دیر بعد جب وہ گھر نہ لوٹا تو سب کو بے حد فکر ہوئی- والد صاحب گھر پر ہی تھے- وہ ولید کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو مجھے فون کیا-

میں پریشانی کی حالت میں گھر پہنچا اور اہل خانہ کے ساتھ مل کر محلے کی گلیوں وغیرہ میں ولید کو تلاش کرنے لگا۔ پھر ہم بیرونی سڑکوں پر گھومنے لگے کہ شاید ولید کہیں دکھائی دے جائے۔ رفتہ رفتہ ہماری پریشانی بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رات ہوگئی لیکن ولید کا کہیں کچھ پتا نہ چلا۔ میری والدہ اور میری اہلیہ نے رو رو کر برا حال کرلیا۔ میں نے تھانے کا رخ کیا تاکہ ولید کی گمشدگی کی بابت رپورٹ کرواسکوں۔ یہاں سے فراغت کے بعد میں ایک بار پھر اپنے موٹر سائیکل پر سڑکوں کی خاک چھاننے لگا۔ عزیز و اقارب بھی گھر پر جمع ہوچکے تھے جن میں سے کئی ایک میرے ساتھ ولید کی تلاش میں مگن تھے۔ نصف رات کو میں مایوس ہوکر تھکا ہارا گھر لوٹ آیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اندر جاتا اس لیے گھر کے باہر ہی تھڑے پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں غنودگی میں تھا جب کسی نے مجھے آواز دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو سامنے ایک صاحب کھڑے تھے جن کے ہمراہ ولید اپنی سائیکل کے ساتھ موجود تھا۔ جلدی سے دوڑ کر ولید کو اٹھایا اور اپنے سینے کے ساتھ بھینچ کر بڑی بے قراری کے ساتھ اس کی بلائیں لینے لگا۔ جو آدمی ولید کو اپنے ہمراہ لایا تھا اس نے بتایا کہ وہ کافی دور سے آیا ہے جہاں ولید ایک پارک کے گیٹ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ولید کو لیے گھر میں آ گیا۔ سارے گھر میں خوشی و شادمانی کی لہریں اٹھ پڑیں۔ پل بھر قبل جہاں نوحہ گری ہورہی تھی وہاں قہقہے گونجنے لگے۔ تب میں اٹھا تاکہ کمرہ میں جاکر آرام کرسکوں تو میری نظر صحن میں رکھی ولید کی سائیکل پر پڑی۔ میں جلدی سے وہاں پہنچا اور سائیکل کو توڑ پھوڑ کر کباڑ میں تبدیل کردیا۔ اس سائیکل پر مجھے بے حد غصہ تھا جس کی وجہ سے ہم سب کو سخت پریشانی اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ تو اُس نیک دل انسان کی مہربانی کا نتیجہ تھا جس کے باعث ولید واپس گھر آ گیا اور جب مجھے خیال گزرتا کہ اگر اُس کی جگہ کوئی خراب نیت آدمی ہوتا تو پھر!! اور یہ سوچتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور میری سانسیں اوپر نیچے ہونے لگتیں۔

پیاری سی سائیکل، جسے میں نے ولید کے لیے بڑی چاہ اور محبت سے خریدا تھا، ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد جب میں پلٹا تو دیکھا کہ والد صاحب میرے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں انھیں دیکھنے کے بعد جوں ہی آگے بڑھا، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہنے لگے:

''بیٹا! میں نے تمھیں اسی وجہ سے سائیکل نہیں دلوائی، ایک دن میں بھی گم ہو گیا تھا۔''

☆☆☆☆☆

سازش

بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہ سوچوں میں گم تھی طرح طرح کے وسوسے اس کی سوچ کا محور تھے۔ مستقبل کو سوچ کر اسکی پریشانی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے لاکھوں روپیوں کا بندوبست کرنے کا کہا تھا ایک طرف غربت اور دوسری طرف دن بدن ماں کی بگڑتی صحت نے اسے مجبور اور لاچار کر دیا۔

یوں تو بچپن سے ہی لاچاری، مجبوری اور بے بسی سے آشنا تھی شاید کسمپرسی کی زندگی ہی اس کا مقدر تھی اس طرح ماں کو اچانک ہارٹ اٹیک آنا اس کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی جب سے اس نے ہوش سنبھالا اپنی ماں کو محنت مزدوری کرتے ہوئے دیکھا اب بھی وہ لوگوں کے گھروں میں صفائی کا کام کرتی تھی اور اپنی بیٹی کی شکم پروری کرتی تھی۔ ماں کو کھو دینے کا ڈر ذہن میں آتے ہی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے فوراً سر جھٹک کر اس کربناک لمحے سے جان چھڑائی۔ اسی اثنا میں کسی نے دروازے پر دستک دی آواز سنتے ہی وہ بے دلی سے قدم اٹھاتے ہوئے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھولا تو سامنے شہاب صاحب تھے۔ شہاب صاحب کو دیکھ کر اس کو حیرت ہوئی اس لیے نہیں کہ وہ اس کے لیے اجنبی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ پہلی بار ان کے گھر آئے تھے۔ رفعت بانو جو طویل عرصے سے ان کے گھر ملازمہ تھی۔ لیکن کبھی وہ یہاں نہیں آئے لیکن شہاب صاحب آج اس طرح کیوں آئے اس کے لیے یہ بات تشویش ناک تھی۔ وہ اس کی حیرت اور تشویش کی ملی جلی کیفیت کو بھانپ گئے اور خاکی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بہت اپنائیت سے بولے، حیا آپ کی والدہ کے علاج کے لیے کچھ رقم ہے رکھ لیں۔ اتنی اپنائیت اور شفقت سے پیش کیے کہ حیا لینے سے انکار نہ کر سکی۔ حیا کی مجبوری اور بے بسی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی اس نے لفافے پر گرفت کو مضبوط کر لیا بالکل ایسے جیسے بھوکے کو کھانے کی پلیٹ

تہنیت رباب

دی جائے تو وہ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے کیونکہ اس نعمت کی میسر نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے شاید حیا کو بھی اس چیز کا خوف تھا۔ حیا کتنی دیر حیرت سے اس لفافے کو دیکھ رہی تھی۔ شہاب صاحب فرشتہ بن کر آئے تھے۔

اگلی صبح ماں کا آپریشن تھا۔ وہ گڑگڑا کر اللہ کے حضور دعائیں مانگ رہی تھی اور دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آج کا سورج اس کی ماں کے لیے زندگی کی نوید لے کر آئے گا اور سب پہلے جیسا ہو جائیگا۔ وہ مصلے پر سجدہ ریز زارو قطار ایسے رو رہی تھی جس طرح طفل بری ماں سے خواہش طلب کر رہا ہو کہ مجھے اس چیز کی شدت سے طلب ہے وہ بھی رب کریم سے اپنی ماں کی صحت ہی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی اے رب کل کائنات میری ماں کی اذیت ختم کر دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے کن فرمادے پھر اس کی دعا سن لی گ ئی دعائیں کبھی رد نہیں ہوتیں اور اسی اثنا میں ڈاکٹر کی آواز پر حیا چونکی۔ مس حیا آئی ایم سوری ہم آپ کی والدہ کو بچا نہیں سکے۔ حیا بلکل سکتے میں ڈاکٹر کو دیکھتی رہی اور آ ایسے محسوس ہوا کسی نے اس کے سر سے سائباں اور پاؤں کے تلے سے زمیں کھینچ لی۔ وہ جس سچائی سے آنکھیں چراتی تھی اس سچائی کا سامنا آج بہت مضبوطی اور صبر سے کرنا تھا کیونکہ وہ ذات بے نیاز ہے اس کے فیصلے اٹل ہیں سو ماں کی موت کا فیصلہ بھی ہو گیا اور وہ اس دنیا میں بے یارومددگار اور لاچار تھی۔ غربت وافلاس کی زندگی سے تنگ آ گئی دن بدن غربت بڑھتی چلی گئی اور نہ کوئی آمدن کا ذریعہ نہ کوئی پرسان حال کبھی مکان کا کرایہ کبھی بجلی کا بل اس سب پریشانیوں سے تنگ آ کر اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ گھر کہ قریب ہی ایک مزار تھا اس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔۔ وہ مزار کے برآمدے پر دیوار کیساتھ ٹیک لگائے سارا دن بیٹھی رہتی تو کبھی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی جو مزار کی راہ داری پر واقع تھیں۔ رات ہوتی تو یہاں ہی چراغ گل کر کے سو جاتی۔۔ آتے جاتے لوگوں کی اس پر نظر پڑتی تو کچھ سکے اس کی جھولی میں ڈال کر گزر جاتے۔۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے بنا کچھ کہے بیٹھی رہتی۔ ان آتے جاتے لوگوں میں حماد بھی شامل تھا حماد اس علاقے کا رہائشی تھا اکثر اوقات مزار پر آتا تھا۔۔ یہ انجان لڑکی اس کے تجسس کا باعث بنی۔ اس کو دیکھ کر اس نے اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کی تو حیا کچھ نہ بولی۔

اگلی صبح وہ ڈر کے مارے سیڑھیوں پر بھی نہیں بیٹھی اپنے اسی پرانے کونے میں بیٹھی جو اس کے لیے جنت تھا جس نے اس کو سر چھپانے کے جگہ دی تھی اور وہ ہی جگہ اس کی غم گسار، رازداں اور نگہبان تھی۔ آج حماد دوبارہ آیا اس نے متلاشی نظروں سے سیڑھیوں پر اس کو دیکھا لیکن اس کو کہیں نہ ملی وہ ادھر ادھر گھومتا رہا اور واپس چلا گیا۔

اگلے روز شام میں وہ پھر مزار کے عقبی صحن میں بیٹھی تھی کہ پھر ایک نامانوس سی آواز سے چونک گئی۔ آپ کیوں پریشان ہیں اور آپ کا نام کیا ہے؟ حیا اس سوچ میں گم تھی کہ نجانے کیوں اس اجنبی کو اس میں کیا دلچسپی کیا اور کیوں اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔۔

وہ ڈر گئی اور سر اوپر نہ اٹھایا اور بھاگتی ہوئی مزار کے برآمدے کی طرف بڑھ گئی جہاں کافی لوگ موجود تھے نجانے کیوں وہ اس نوجوان سے چھپی تھی اور اس سے ڈری سہمی تھی شاید معاشرے میں لوگوں نے اس سے کبھی ہمدردی اور محبت نہیں کی اس لیے یہ ان جبروں سے ڈرتی تھی اور اس طرح کی ہمدردیاں اس کو بری لگتی تھیں۔ اس طرح کافی دن گزر گئے حماد روزانہ وہاں آتا اس سے وہی سوال دہراتا جواب نہ ملنے پر واپس چلا جاتا۔ پھر کچھ ضروری کام کے سلسلے میں حماد کو کراچی جانا پڑا۔ ان دنوں حیا حماد کی کمی کو محسوس کرتی رہی اور سوچتی تھی وہ مسیحا کہاں ہے جو آ کر اس سے ہمدردی تو جتا جاتا تھا۔ اب وہ ہر وقت پریشان رہتی کیونکہ وہ اس نوجوان کو نہیں دیکھ پاتی۔ رات کو سوچوں میں گم اس کی بات یاد کرتی اور بار بار وہ نامانوس لیکن محبت بھری آواز اس کے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی لیکن اب وہ آواز اس کے لیے ہمیشہ کے لیے گم گئی تھی شاید وہ دوبارہ نہ سن پائے گی۔ آج دوپہر کے وقت وہ دھوپ اور گرمی سے بے نیاز صحن میں بیٹھی تھی کہ اچانک اس کی نظر حماد پر پڑی۔ حماد کو دیکھ اس کی آنکھ میں چمک آ گئی عجیب ہی کیفیت جو اس کے ناقابل بیان تھی وہ شاید حماد کو ڈھونڈ رہی تھی اور وہ مل گیا دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی آج اس نے سوچا اس سے ضرور بات کرے گی یہ آخر کون ہے اور کیوں اس کو حیا کی زندگی میں دلچسپی ہے۔ حماد جو متلاشی نظروں سے اس دیکھنے کے لیے ادھر ادھر پھر رہا تھا اس کی نظر اس پر پڑی وہ اس کی جانب دوڑا اس کے قریب بیٹھ گیا اور بولا آپ یہاں ہیں۔ میں کب سے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ کیسی ہیں آپ؟ اس کے سوال پر حیا چونک گئی کہا کوئی اسے اس قابل سمجھتا

کہ اس سے حال پوچھا جائے۔ پہلا سوال دوسرے سوال سے زیادہ توجہ طلب تھا۔ آخر وہ کیوں اس طرح اس کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اس تذبذب کے عالم میں حماد نے آج پھر وہی سوال دھرایا آپ کا نام کیا ہے؟ اس سے ہچکچاتے ہوئے کہا! حیا اور حیا اگلے ہی لمحے حیا نے سوال کیا کہ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ حماد نام ہے میرا اور میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ آج نجانے کیوں حیا کو اس کی باتیں بری نہیں لگیں بلکہ بہت غور سے اس کی ہر بات سن رہی تھی اور اس طرح کب باتوں ہی باتوں میں حیا نے اپنی ساری کہانی اس اجنبی آدمی سے کہہ ڈالی۔ مشکل حالات میں آپ کا ساتھ دینے والا اور محبت، تسلی کے دو بول بولنے والا چاہے کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو آپ کے بہت قریب ہوتا حماد بھی وہی اجنبی لیکن دل کے قریب رہنے والا تھا۔ حماد کو کہانی سناتے ہوئے زاروقطار رو رہی تھی۔ اس نے تسلی دی اور دلاسہ دیا کہ اس کی مدد کرے گا اس نے حماد سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ حماد کی ہر بات ماننے لگی۔ اب حیا، حماد کو اپنا مسیحا، ہم نوا اور ہم راز جاننے لگی اور اس کی محبت اور اپنائیت کے سحر میں گرفتار ہو گئی۔ زندگی کی تنہائی میں اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جن آپ کے لیے کوئی چراغ لے کر آئے اس کو بھلانا مشکل ہی نہیں ممکن ہوتا ہے۔ کچھ روز کے بعد حماد آیا اور اس کو کہا کہ اس کو یہاں سے دور لے کر جانا چاہتا ہے جہاں اسے سائباں اور سکون بھی عزت کی زندگی بسر کر سکے اب حیا کو حماد پر اعتبار آنے لگا۔ حماد نے اس کے لیے الگ ایک گھر کا انتظام کیا اور حیا کو بتایا کہ ابھی والدین کو بتانا مناسب نہیں وقت آنے پر وہ اور حیا والدین کی رضامندی سے شادی کر لیں گے۔ حیا مان گئی جب محبت ہو تو وہاں اعتماد ہی سب سے ضروری ہوتا ہے۔ ویسے بھی محبتوں میں نفع و نقصان اور صحیح غلط کب نظر آتا ہے حیا کی رضامندی سے وہ اسے گھر لے آیا۔ حماد روزانہ اس کے پاس آتا اس کو محبت و وفا کا یقین دلاتا اس کے ساتھ وقت گزارتا اور چلا جاتا۔ کچھ دن تو بہت خوب صورت رنگیں اور خوشیوں سے بھرپور تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد حیا نے حماد سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ اتنا وقت ہم نے گزارا۔ اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے وہ حیا پر اعتبار کرے ہر مشکل میں وہ اس کا ساتھ نبھائے گی نکاح کرے اور مناسب وقت آئے تو وہ اپنے والدین کو نکاح کا بتا دے۔ لیکن حماد اس کے لیے رضامند نہ ہوا

وہی معاشرتی و سماجی مجبوریوں کا سبق سناتا کہ وہ بہت مجبور ہے اپنی خاندانی اقدار اور اخلاقیات کے خلاف نہیں جا سکتا۔ اب حیا کے دل میں حماد کے لیے وسوسے جنم لینے لگے اور شک و شبہات میں مبتلا ہونے لگی۔ حماد نے آج بھی اسے کہا کہ وہ حالات کے ہاتھوں بے بس ہے لیکن حیا کو عزت کی روٹی اور مکان دیا ہے اب وہ اس کی ذمہ داری ہے وہ اکیلی نہیں ہے۔ لیکن حیا نہ مانی تو اس نے سرد مہری سے کہا کہ احسان مانو کہ اس نے اسے چھت دی اور عزت سے رکھا ہوا ہے اس کی پناہ میں خود کو محفوظ سمجھے حماد کے کہے الفاظ اس کے لیے کسی تیر کی مانند تھے وہ بہت اداس اور تنہا ہوگئی آخر اس کو روٹی اور مکان ہی چاہیے تو وہ تو حماد دے رہا ہے۔ وہ برف لہجہ اسا سکو بہت افسردہ کر گیا وہ اکثر سوچتی کیا محبتیں، وفائیں اور بے لوث خلوص کا یہی نتیجہ ہوتا، کیا اس کے مقدر میں کسی کی عزت بننا نہیں ہے کیا حماد بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں کی طرح صرف اس کا وقتی ہمدرد ہے؟ کیا بے لوث محبتوں کے امین ایسے ہوتے؟ آج حماد کی منگنی تھی آج رات منگنی کے فنکشن کے بعد وہ حیا کے پاس آیا اور اسے کہا کہ کل ہم نکاح کریں گے؟ اس کی اس بات پر حیا کو ناقابل یقین حیرت نے گھیر لیا یہ اسکے لیے خوشی کی خبر تھی۔ اس کو اپنے سپنے سچ ہوتے دکھائی دے رہے تھے اور بے شک من چاہے شخص کا ساتھ مل جانے سے بڑی اور کیا خوشی ہو سکتی ہے یہ احساس کتنا خوب صورت تھا حیا سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ وہ خود کو خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی تھی۔ حماد کی صورت میں اسے خوشیاں نصیب ہو رہی تھی اور وہ تمام خوشیاں جو اس نے صرف خوابوں میں تصور کیں تھیں۔ حماد اس کے لیے عروسی لباس لایا تھا ساری رات اس خوشی میں مگن لباس کو دیکھتی اور کبھی خود کو آج تو نیند بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

آج وہ بہت خوب صورت ایک پری لگ رہی تھی زندگی نے اسے کبھی موقع نہیں دیا کہ خود کو آئینے میں دیکھے آج اس کو اپنے حسن پر رشک آرہا تھا۔ وہ عروسی لباس میں ملبوس حماد کا انتظار کر رہی تھی حماد نے دروازے پر دستک دی اس کو ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی ایک انجان سڑک پر ڈال دی۔ وہ خود کو اس کی موجودگی میں محفوظ محسوس کر رہی تھی وہ ہی تو اس کی محبت اور عصمت کا واحد محافظ تھا۔ تھوڑا دور جا کر حماد نے گاڑی سڑک کے کنارے ایک سنسان

جگہ پر روک دی- حیا کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ اس کے سامنے جو کالے رنگ کی کار ہے وہ اس کے دوست ہیں شاید ان کی گاڑی کو کوئی مسئلہ درپیش ہے اس لیے رُکے ہوئے ہیں- حیا خاموشی سے بیٹھ گئی حماد نیچے اترا اس نے ان سے کچھ بات چیت کی اور دوسری گاڑی میں بیٹھنے لگا تو حیا نے آواز دی کیا مسئلہ ہے؟ سب ٹھیک ہے- حماد کے جواب نہ دینے پر حیا کو خوشی کی جگہ تشویش نے گھیر لیا اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتی سامنے کھڑے شخص نے حیا کی طرف قدم بڑھائے اور آتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا حیا اس سے پہلے کوئی سوال کرتی ایک زناٹے دار تھپڑ اس کی گالوں پر پڑا وہ مزید کچھ بولتی دوسرے شخص نے پھرتی سے اس کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دیا اور اس کو بے ہوش کرنے کے لیے کوئی رومال اس کے ناک پر دبا دیا اور پھر اس کو ہوش نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے؟

جب اسے ہوش ہوا تو ایک اجنبی کمرے میں خود کو لیٹا ہوا پایا اور گھنگھروؤں کی آواز سے اس کا دل دہل گیا- ابھی وہ اسی اضطراب اور کشمکش میں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے کہا: جلدی کرو سیٹھ صاحب پچھلے بیس منٹ سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں-

اس آواز پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے- کیا یہی اس کی زندگی کی حقیقت تھی- کیا واقعی ایک بے یار و مددگار عورت کے حصے میں یہیں سزائیں: ان کی عصمتوں کے اس طرح ہی سودے کیے جاتے- جب چاہتوں امین خود ہی ان کے خائن ہوں کیا انسان زندہ رہ سکتا وہ بظاہر تو زندہ تھی لیکن اس کی روح مر گئی تھی- روح کی موت جسمانی موت سے زیادہ کرب ناک ہوتی تھی وہ اس کرب میں مبتلا تھی جو اسکے وجود کو چھلنی کر رہا تھا بظاہر زندہ لیکن اندر سے چھلنی وجود کے ساتھ ایسے ہی زندگی گزار رہی تھی-

چھت اور دو وقت کی روٹی کے لیے تو حماد سے اصرار کیا اور یہی اس کی ضرورت تھی وہ میسر آ گئی تھی- اب صبح و شام اس طرح کے کتنے ہی حماد اس کے زار داں سننے کی کوشش کرتے ہمدردیاں کرتے جھوٹے دلاسے اور تسلی اس کا مقدر بن چکے تھے اور وہ اس حقیقت کو تسلیم کیے زندگی کے دن گزار رہی تھی- یہ وہ اذیت ناک موت تھی جس کا درد وہ پل پل محسوس کرتی تھی وہ کمرے کی کھڑکی سے دور تک پھیلی روشنیوں کو دیکھ سوچ رہی تھی کہ اس طرح محبتوں کے فریب میں آ کر سینکڑوں بے بس اور مجبور حیا اس روشن شمشان میں مدفون ہیں--

☆☆☆☆☆

نادان مکیں

محمد علی

شہر کے درمیان ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس کی دیواریں رشتوں کی دڑاڑوں سے تڑکنا ہی چاہتی تھیں۔ اس مکان کے کونے میں ایک قریب المرگ شخص پڑا تھا۔ جس کی نگاہیں اس کے پلنگ کے اوپر لگے بلب پر جمی تھیں۔ شاید وہ اس بلب کی روشنی سے اپنی زندگی میں آئے اندھیروں کو دور کرنے میں مصروف تھا۔ وہ بوڑھا تھکا ہارا شخص جسے ہمیشہ اس کے قرابت داروں نے مایوس کیا، اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ زندگی کے جھگڑوں سے چھٹکارا پانے کا وقت قریب آچکا ہے۔ مگر پھر بھی اس کے ہونٹوں پر مایوسی کو ظاہر کرتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ اس کے کپکپاتے ہونٹ شاید فرشتوں سے ہم کلام ہوتے۔ وہ خود کو انھی کے سپرد کرنا چاہتا تھا، وہ ایسی دنیا سے رخصت چاہتا تھا جہاں کے لوگ اسے اجنبی سمجھتے ہوں اور تو اور اس کے اہل خانہ کو بھی اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ بے پروائی سے نظر انداز کیا جانے والا

تنہا انسان جس کا لباس اور خوراک سادہ تھی وہ اپنے قرابت داروں سے چاہتا ہی کیا تھا؟ صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔ یہ چراغ نما آدمی جو ساری عمر دوسروں کی زندگی روشن کرنے کے لیے جلتا رہا آج اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سارے قہقہے، روشن محفلیں، شعروشاعری اور رات گئے کی بیٹھکیں سب آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں۔ مگر یہ کمال ڈھب انسان پھر بھی ہمت ہارتا نظر نہ آتا تھا۔

اس کی صحت گزشتہ ایام کی بہ نسبت زیادہ بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بے شک آرام بہت ضروری تھا مگر ڈاکٹروں کے مطابق علاج کروانا بھی ضروری تھا۔ حالانکہ اوویات اس کے مرض میں اضافہ ہی کر رہی تھیں۔ مجھے اب علاج کی ضرورت ہے نہ ادویات کی اور نہ ہی آرام میرے جسم کی طاقت کو بڑھا سکتا ہے۔ مجھے تو اب میری مددگار عزیزہ من کی ضرورت ہے۔ بہت سے ایسے مسائل ہیں جسے اس کی رفاقت میں زیر بحث لانا چاہتا ہوں۔ آخر زندگی کے نشیب و فراز ہم نے اکٹھے گزارے ہیں۔ شاید کہ عزیزہ من کی قربت سے میں کچھ سنبھل سکوں۔ اب تو اپنی اس علالت سے بے زار آ چکا ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس علالت سے موت ہی اچھی۔ یہ ہی سوچتے ہوئے پانی اس کی آنکھوں میں اُمڈ آتا۔ بڑبڑاتا، کپکپاتا جب بھی عزیزہ من کو پکارتا تو جواباً شکوے شکایتوں کے انبار سننے کو ملتے۔ اپنوں اور بیگانوں کے مطالبات پورے کرنے کے طعنے پڑتے اور وہ کڑھتا، سر پٹختا اپنے بستر پر ہاتھ مارتا رہ جاتا۔ اس روزانہ کی بک بک سے یہ بوڑھا شخص نجات چاہتا تھا۔

آ، اے موت میرے قریب آ، مجھے ان لوگوں سے نکال جو مجھے اجنبی سمجھتے ہیں اور میری زندگی بھر کی کمائی کے پیچھے پڑے ہیں۔ میرے کپکپاتے ہاتھ بھی ان کا دل نرم نہیں کرتے اور میری وہ اولاد جسے میں اپنے جیسا سمجھتا تھا انتہائی پُرسکون کیفیت میں کئی کئی دن میرے سے کنارا کشی کرتی ہے۔ جسے مجھ سے اور میرے خوابوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جب بھی میں نے اپنا خلوص ان پر ظاہر کیا تو انھوں نے اسے فضول کوشش گردانتے ہوئے بیزاری ظاہر کی، یوں میرے جذبات کو بارہا ٹھیس پہنچائی۔ ایام شباب میں دنیا کی خوبصورتی کو چھوڑتے ہوئے میں نے اولاد کے لیے سب کچھ

کیا، اپنا خون جلایا، سر پر دھول ڈلوائی، تھکن کی شدت سے امڈتے آنسوؤں کو ان تک نہ پہنچنے دیا مگر عمر کے اس آخری حصے میں یہ مجھے بے قراری اور اضطرابی حالت میں دیکھتے ہوئے کتنے ساکت ہیں۔ میری افسردگی وقت کی رفتار کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ میری ہر آرزو آج میرے خواب کی طرح مجھ سے دور ہے۔ کاش میری رفیقہ حیات اور میری اولاد میری آرزوؤں کو پورا کرتے۔

آہ! میری سوچ جسے میں دنیا کی چمکیلی بہاروں اور پُرسکون شاموں سا مکمل سمجھتا تھا اور جسے طلوع آفتاب سے وقت غروب تک ڈولنے نہیں دیتا تھا، آج اس لمحہ خاص میں بہت ہلکی ثابت ہوئی۔ یہ بھی میرے قرابت داروں کی طرح اس عمر میں مجھے دھوکہ دے گئی۔ اس بڑبڑاتے ہوئے بوڑھے شخص کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا جس میں ماضی ٹکڑے ٹکڑے تیر رہا تھا۔

اگلے دن دوپہر کو لوگ اس بوڑھے شخص کے گھر جمع ہونے لگے، چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ بڑا نیک، نرم دل انسان تھا، ہر کسی کی مدد کرتا تھا، مگر اس چھوٹے مکان کے دوسرے کونے میں موجود بوڑھے شخص کی رفیقہ حیات اور اس کی اولاد بوڑھے شخص کی بیچارگی اور اکیلے پن کی مشکلات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہاں موجود ہجوم کو اس کی موت کی منحوس خبر سنانے میں مگن تھے۔ وہ تنہا شریف بوڑھا شخص اس مادی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ عظمت اور اعلیٰ معیار کا لباس زیب تن کر کے وہ اس کائنات میں داخل ہو چکا تھا جہاں اسے کوئی دکھ اور مشکل نہ تھی۔ وہاں کی رہنے والی نیک روحیں اس کی منتظر تھیں اس کی رفاقت سے بہت خوش بھی ہیں۔ ایسی ہی کائنات کی اس بوڑھے شخص کو ہمیشہ کشش رہی اور اپنے انداز گفتگو کو وہاں موجود فرشتوں سے ہم کلام ہونے کے لیے میٹھا اور خالص بناتا رہا۔

اب اس گھر میں بکھرے اوراق کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ اوراق جن پر وہ اپنی زندگی لکھا کرتا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، وہ کچھ سمجھانا چاہتا تھا، مگر یہاں کسی کے پاس فرصت نہیں تھی، آخر وہ بوڑھا، تنہا شخص رخصت ہو گیا۔

گھر کے مکینوں نے اس کی ایک تصویر دیوار پر سجائی اور سال میں ایک بار اُسے یاد کرنے کا عہد کرتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆☆☆

زمینی جوڑا

''بٹیا اُٹھ جا، چار بج رہے ہیں-- پانچ بجے وہ لوگ آجائیں گے'' قدوس صاحب نے اپنی سوئی بیٹی نجمہ کا آہستہ سے کاندھا ہلایا۔

''جی ابو'' نجمہ اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے فوراً اُٹھ بیٹھی۔

''اور دیکھ ٹھیک سے تیار ہوجانا، تیری ماں زندہ ہوتی تو مجھے یہ ہر بار کہنا نہیں پڑتا، تو خود سمجھ دار ہے -- بس کوئی کسر نہ رہے'' وہ لجاجت سے بولے ''تیری چھوٹی بہن سسرال سے آگئی ہے، ان لوگوں کے لیے کچن میں ناشتہ تیار کر رہی ہے، ایک نظر وہاں بھی مار لینا'' یہ کہہ کر انہوں نے خود کو موڑا اور اسٹک کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

نجمہ بیڈ پر گم سم سی بیٹھی اپنے بوڑھے بیمار اور فالج زدہ والد کو مغموم اور بے بسی کی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھنے لگی، وہ اُن کی اس صورت حال کی ذمے دار خود کو ٹھہراتی تھی اور یہ بات بہت حد تک درست بھی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں بہت زیادہ دباؤ میں رہنے لگے تھے، پہلے بلڈ پریشر، پھر شوگر اور ایک دن فالج کی زد میں آکر اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے، فالج کی وجہ سے انہوں نے سرکاری ملازمت ختم ہونے سے، دو سال پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی، ویسے بھی اب ان کو پیسے پائی کی زیادہ ضرورت نہیں تھی، دونوں چھوٹی بیٹیوں کو وہ پہلے ہی رخصت کر چکے تھے، اب صرف بڑی بیٹی نجمہ رہ گئی تھی، اُس کے لیے انہوں نے مناسب پس انداز کیا ہوا تھا، جوانی میں بیوی کے انتقال کے بعد وہ تینوں بیٹیوں کے لیے باپ کے ساتھ ماں کا کردار بھی ادا کرتے رہے، اُن کی بہترین پرورش اور اچھی تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، نجمہ کی شادی بھی وقت پر ہوجاتی لیکن وہ اپنے والد اور گھر کا سہارا بنی رہی، اُس نے اپنی بہنوں کی خاطر نہ صرف شادی سے گریز کیا بلکہ اپنی تنخواہ اور ٹیوشن فیس سے بہنوں کی شادی اور ان کا جہیز بنانے میں والد کی بھرپور مدد کی، اب جب کہ وہ شادی کی عمر پار کر رہی تھی اور تھائی رائیڈ نے چہرے کے نقوش اور بدن کو ڈھرا دیا تھا، اُس کے مناسب رشتے آنا تقریباً بند ہوگئے تھے، سرکاری معلّمہ ہونے کی لالچ میں کچھ

شکیل احمد خاں

رشتے آئے بھی مگر اُسے دیکھ کر وہ دوبارہ نہیں لوٹے، بڑی عمر اور دوسری شادی کے خواہش مند، ایک دو آنے والے رشتے اپنے لیے کم عمر اور چاندسی دُلہن چاہتے تھے، اس لیے ان سے بھی کوئی بات نہیں بنی، یہی وہ وفکرات تھیں جو قدوس صاحب کو چکرائے دے رہی تھیں۔

ان حالات میں نجمہ کا دل بھی شادی سے اچاٹ ہو چکا تھا، اُس کے اندر شادی کو لے کر کوئی امنگ، کوئی جذبہ بے دار نہیں ہوتا تھا لیکن وہ والد کی پریشانی اور فکرات کو دیکھ کر جب بھی کوئی اُسے دیکھنے آتا، وہ تیار ہو جاتی تھی، اُس نے ان ہی کے کہنے پر، اپنا وزن گھٹانے کے لیے شام کو قریبی پارک میں جوگنگ کا آغاز بھی کر دیا تھا اور وہ وہاں سے پسینے میں تر بہ تر ہو جانے کے بعد ہی لوٹتی تھی، اس دوران اُس نے کچھ پونڈ وزن کم بھی کر لیا تھا، مگر دنیوی معیار پر آنے میں ابھی بھی سخت محنت درکار تھی۔

آج کا نتیجہ بھی پچھلے نتیجوں سے مختلف نہیں نکلا، حالاں کہ آج اُس نے چھوٹی بہن کے ساتھ مل کر غیر معمولی بناؤ سنگار کے ساتھ موٹے بدن کو چھپانے کے لیے چُست لباس بھی زیب تن کیا تھا، لیکن وہ پھر رد کر دی گئی تھی، والد کے چہرے پر لکھی مایوسی پڑھنے کے بعد اُس نے غصّے کی حالت میں پہلے میک اپ سے سجا اپنا چہرہ دھویا اور لباس تبدیل کر کے پارک جانے کے لیے گھر سے نکل گئی، وہاں پہنچ کر وہ کچھ دیر تک گم سم سی کھڑی رہی، ناکامی اور غصّے نے اُس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو کر رہ گئی تھی، پھر اُس کے من میں نہ جانے کیا آیا، وہ پارک میں بنی مٹی کی گزرگاہ پر معمول کی طرح تیز تیز چلنے کے بجائے دوڑنے لگی، یہ سوچے بنا کہ آس پاس کے لوگ اُسے کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟ اُس کے بارے میں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ سب کی پروا کیے بغیر، بس دوڑے جا رہی تھی، دوڑتے دوڑتے جب اُس کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور غصّے کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تو اُسے ہوش آیا، اُس نے فوراً اپنے قدم روکے اور لوگوں کی حیرانی سے دیکھتی نظروں سے بچنے کے لیے، دیوار کی طرف رخ کر کے اپنی تیز چلتی سانسوں پر قابو پانے لگی، سانسوں کی رفتار جب کچھ دھیمی پڑی تو وہ گھر واپسی کے لیے، دائیں بائیں دیکھے بغیر، آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب بڑھنے لگی، گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر کنارے پر بنی سیمنٹ کی بینچ کی طرف اُٹھ گئیں، اتفاق سے آج بھی وہ شخص وہاں بیٹھا، پان گٹکا چباتے ہوئے اُسے بغور دیکھ رہا تھا، یہ اُس کا روز کا معمول تھا، وہ نجمہ کو اپنے ہر چکّر

میں اُسی بینچ پر بیٹھا، اُسے گھورتا اور مسکراتا ہوا ملتا تھا اور وہ اس حرکت پر اُسے نفرت سے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیتی تھی، لیکن آج اُس کی نظر ہر طرح کے جذبے سے عاری تھی۔

قدوس صاحب نجمہ کے نکاح پر بہت خوش نظر نہیں آ رہے تھے، انہیں اپنے داماد میں بس ایک کمی کا احساس تھا کہ وہ ہم زبان نہیں تھا مگر بیٹی کی پسند اور ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے، اس کے علاوہ لڑکا بی اے پاس اور تعلیم کے محکمے میں ملازم تھا، عمر بھی اُس کی زیادہ نہیں تھی، نجمہ سے تین چار سال ہی بڑا تھا، یہ ساری معلومات اپنے والد کو نجمہ ہی نے فراہم کی تھی، شادی کی مختصر اور سادہ تقریب بھی اُس نے اپنی مرضی چلاتے ہوئے گھر پہ ہی رکھی تھی اور دولہا کی طرف سے صرف اُس کے گھر والوں کو اور اپنی فیملی میں سے دونوں بہنوں اور بہنوئیوں کو اس تقریب میں مدعو کیا تھا۔

رخصتی کے وقت اُس کی بہنوں نے اُسے دولہے کے ساتھ صوفے پر لا کر بٹھا دیا، موٹی ہونے کے باوجود وہ دُلہن کے رنگ روپ میں، نظروں کو جھکائے بہت خوب صورت لگ رہی تھی، اور کیوں نہ لگتی، سب سے چھوٹی بہن نے جو ایک ماہر بیوٹیشن بھی تھی، اپنی ماں جیسی پیاری بہن کا دل سے بناؤ سنگار کیا تھا، دولہا بھی اُسے دیکھ کر نظروں نظروں میں واری واری جا رہا تھا، اُس کی ماں، بھائی اور دونوں بہنوں کی نظریں، دُلہن کے حسن سے زیادہ اُس کے گہنوں پر تھیں اور ان کے درمیان موضوع بحث تھا کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی، جب کہ والد اور بڑا بھائی قدوس صاحب سے باتوں میں لگے ہوئے تھے، اس دوران اُن کی نظریں وقفے وقفے سے اپنی بیٹی نجمہ پر بھی اُٹھ جاتی تھیں، وہ مسلسل اُس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ملی تھی۔

دولہے کی کار میں بیٹھنے سے پہلے وہ اپنی بہنوں اور بہنوئیوں سے بڑی خوش دلی سے ملی البتہ اپنے والد سے ملتے وقت اُس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں مگر چہرہ مسکراہٹ لٹاتا رہا، دُلہن کی اس ذو معنی کیفیت کو کسی نے خوشی اور کسی نے اپنوں سے بچھڑنے کا نام دیا اور وہ اسی حالت میں دولہے کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

کار ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ دولہا نے دونوں پاؤں کے جوتے اُتارے اور اپنی دائیں ٹانگ اٹھا کر سیٹ پر رکھ لی، پھر وہ نجمہ کے قریب ہوتے ہوئے بولا ”بہت طلب ہو رہی ہے، اگر اجازت ہو تو، منہ میں گٹکا دبا لوں، قسم سے تین گھنٹے ہو گئے ہیں، منہ میں تراوٹ نہیں آئی“۔

☆☆☆☆☆

وقت پانی اور جوانی

امین کنجاہی

وہ اپنے سیکشن میں بیٹھا اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا اور اپنی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے اپنی فکرمندی کا اظہار کر رہا تھا، اور اپنی ریٹائرمنٹ کے نوٹیفکیشن کا منتظر تھا، اُس نے اپنے ماتحتوں کو یہ بتایا ہوا تھا، کہ جب بھی اُس کے نام کا نوٹیفکیشن جاری ہو اور وہ آر اینڈ آئی میں اُس کی کاپی آئے تو اُسے فوری طور پر دے دی جائے، اور اگر وہ چھٹی پر ہو تو اُسے وہ کاپی وٹس ایپ کر دی جائے، اُس کے Immediate Boss جی ایم جن کا نام غلام محمد تھا، اُن کو سب لوگ جی ایم کے نام سے بلاتے تھے، اُن کے ساتھ اِس کی بڑی اچھی Under Standing تھی، وہ دونوں صبح دس بجے کینٹین چلے جایا کرتے اور وہاں پر اکٹھے بیٹھ کر چائے پیا کرتے، گپ شپ لگاتے اور سگریٹ پیا کرتے، اِسے سگریٹ پینے کی کوئی عادت نہیں تھی، مگر پھر بھی، جی ایم کے ساتھ بیٹھ کر ون گو میں تین تین سگریٹ پی جایا کرتا، اور سگریٹ بھی جی ایم صاحب سے لے کر پیا کرتا تھا، یہ اور بات تھی کہ، وہ جی ایم کو

ہفتے میں Gold Leaf کی چار ڈبیاں
لے کر دیا کرتا تھا، اُسے اِس ادارے میں
آئے 25 برس ہو چکے تھے، اِس سے پہلے
وہ پوسٹ آفس میں چھ برس اور چار مہینے لگا
کر آیا تھا، پھر Through Proper
Channel اس نے اپنا ادارہ بدل لیا،
اور اب اِس کی ریٹائرمنٹ نزدیک آ گئی تھی،
ریٹائرمنٹ سے چار ماہ قبل ایچ آر والے
ریٹائرمنٹ کا نوٹس جاری کر دیا کرتے ہیں،
اور پھر چار ماہ کے اندر اندر اُس کی پرسنل
فائل کا آڈٹ اور کلیئرنس کی جاتی ہے، اگر
کوئی Disciplinary Action نہ
ہو، اور کوئی اُس کی فائل میں Red
Entry نہ ہوئی ہو، تو Clearance
بڑے آرام سے ہو جاتی ہے، پھر بھی اُسے
دھڑکا لگا رہتا تھا، کہ تمام کام آرام سے کلیئر
ہو جائیں، تاکہ اُسے کوئی ذہنی اذیت نہ
اُٹھانی پڑے، خدا خدا کر کے، ریٹائرمنٹ کا
نوٹیفکیشن جاری ہو گیا، اور اپنے ساتھیوں کو
ہنس کر کہنے لگا، کہ یار آپ لوگوں نے مجھے
جب فیئر ویل پارٹی دینی ہے، تو اُس میں
مجھے جائے نماز، قرآن پاک، ٹوپی، اور تسبیح اس
طرح کی کوئی چیز مجھے مت دینا، اور میں
چاہتا ہوں، کہ میں اپنی فیئر ویل پارٹی کے
اخراجات بھی خود برداشت کروں، اور آپ
لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گا، کیونکہ مجھے 31
برس چار مہینے اور دس دن ہو چکے ہیں،
سرکاری نوکری کرتے ہوئے، اور اِن تمام
برسوں مہینوں اور دنوں میں جتنے بھی لوگ
مجھ سے پہلے ریٹائر ہوئے ہیں، ہمارے
سیکشن میں، ہم نے ہمیشہ اُن کی ریٹائرمنٹ
پر پارٹی دیتے ہوئے، پیسے جمع کرنے پر
جھگڑا کیا ہے، کبھی 50 روپے کبھی 100
روپے پر خدا کے لئے میں نہیں چاہتا، کہ
میرے ساتھ بھی آپ لوگوں کا ایسا ہی رویہ
ہو، اور میں جاتے جاتے، تلخ یادیں لے کر
ساتھ نہیں جانا چاہتا، اِس بات پر عامر اس
کے دوست نے قہقہہ لگایا، اور کہا نہیں نہیں
ایسے نہیں ہوگا، آپ ہم سے بڑے ہیں
سینیئر ہیں، ہمارے دوست ہیں، ہمارے
بھائی ہیں، اور آفس میں بیٹھے ہوئے تمام
چھوٹے بڑوں کی یہی رائے تھی، ہم خود
پارٹی کا اہتمام کریں گے، اور کرونا کے
باوجود ہم یہ پارٹی کریں گے، اور آفس میں
نہیں کریں گے آفس سے باہر کسی اچھی جگہ،
پر بیٹھ کر آپ کو اچھے طریقے سے خدا حافظ
کہیں گے، جب اُس کے ہاتھ میں
ریٹائرمنٹ کا نوٹیفکیشن آیا، جس میں کہ بتایا

گیا تھا کہ، عارف 18 جنوری 2021ء سے اِس ادارے سے ریٹائرڈ ہو جائے گا، اور اُس کا نام پے رول سے نکال کر پینشن اور ریٹائرڈ سٹاف میں شامل کر دیا جائے گا، اُس میں مزید یہ بھی لکھا تھا، کہ اُس کا اپنا اور اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹی کا میڈیکل فراہم کرنا ادارے کی ذمہ داری ہوگی، اور ادارے کی پالیسی کے مطابق اُسے پینشن اور کمیوٹیشن اُس کی Basic تنخواہ کی بنیاد پر ادا کی جائے گی، جب وہ یہ سب کچھ پڑھ رہا تھا، تو اچانک وہ ماضی کے جھرنکوں میں چلا گیا، جب آج سے 31 برس پہلے وہ ڈاک خانے میں یوڈی سی، یعنی Upper Division Clerk بھرتی ہوا تھا، اور اُس کی پہلی تنخواہ 1491 روپے تھی، اور اُس کے ایک سال بعد اُس کی شادی ہوگئی تھی، اور شادی کے ایک برس بعد اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک خوبصورت بیٹی کی رحمت سے نوازا تھا، آج وہ بیٹی اُس کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی ہے، اور وہ ایک ڈاکٹر ہے، جب کہ بیٹی کے پیدا ہونے کے تین سال بعد اُس کے ہاں رب نے بیٹے کی نعمت عطا فرمائی، اور وہ بیٹا آج ایم فل پارٹ ٹو میں ہے، اور پھر اُس کی شادی کے 12 برس بعد اُس کے ہاں دوسری بیٹی پیدا ہوئی جو کہ اب 2nd Year کے امتحانات کی تیاری کر رہی ہے، نوکری کے شروع کے دن اُس کے لئے کافی مشکل تھے، کیونکہ تنخواہ کم تھی، اور گھر کا خرچہ چلانے میں کافی دشواری پیش آتی تھی، مگر اُس کے والدین اُس کے ساتھ تھے، جس کی وجہ سے اُس کے گھر کا نظام احسن طریقے سے چلتا رہا، پھر وقت پانی کی طرح بہتا رہا، اور بڑھاپا جوانی کی دہلیز پار کر کے، اُس کے روح اور جسم میں سرایت کرتا چلا گیا، مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری اور آج وہ جس مقام پر بیٹھا تھا، بڑا مطمئن سرشار اور خوشحال تھا، اِن 31 برسوں میں اُس نے اپنے بہت سے پیارے رشتے کھو دیئے تھے، جن میں اُس کے ماں باپ، اُس کی ساس سسر، اور اپنا بڑا بھائی، اُس کی بیوی شادی کے اڑھائی برس بعد کینسر کی مہلک مرض میں مبتلا ہوگئی تھی، جو کہ آج تک اُس کے ساتھ یہ بیماری چل رہی ہے، اُس کو ماضی کے جھرنکوں میں اپنے ناکام عشق بھی یاد آ رہے تھے، کیونکہ جب بھی اُس نے کسی خوبصورت چہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اُسے ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا، گو کہ اُس کے

تعلقات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بہت اطمینان بخش تھے، مگر وہ اندر سے، بہت بے چین رہا، اور یہ سلسلہ اب تک، جاری و ساری ہے، کیونکہ وہ اپنے اندر سے اپنے آپ کی تلاش میں گم رہا، مگر اُس سے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا، جو اُس کی وحشتوں کا ساتھی ہوتا، اُس کے دل کی تاریکیوں کو روشن کرتا، اور اُس کے عشق کے کاسے میں اپنے حسن کی خیرات ڈال دیتا، مگر اُس نے آج تک اس چیز کا احساس اپنی بیوی بچوں کو نہیں ہونے دیا، مگر اُس کی بیوی بڑی جہاں دیدہ تھی، وہ جانتی تھی، کہ وہ اندر سے اکیلا ہے، مگر اُس نے کبھی اس سے اِس بارے میں بات نہیں کی، اس کے جتنے بھی عشق کے قصے اور کہانیاں تھیں، وہ اُن کو جانتی تھی، اُس کے باوجود اُس نے ایک باوفا بیوی ہونے کا ثبوت دیا، اور اپنے بچوں کو بڑے احسن طریقے سے سنبھالے رکھا، مگر وہ کبھی کبھی شدید ڈپریشن میں چلا جاتا اور کئی دن کمرے سے باہر نہیں نکلتا، نہ ہی آفس جاتا، وہ اپنے فون بند کر دیتا، اور بڑی مشکل سے، تھوڑا بہت کھانا کھاتا، اور اینٹی ڈپریشن کی گولیاں کھا کر سویا رہتا، آج جب اُسے اپنی ریٹائرمنٹ کا نوٹیفیکیشن ملا، تو اُسے ایسے لگا، کہ جیسے اُسے یہ اطلاع دی جا رہی ہے، کہ بھائی صاحب اب آپ سٹھیا گئے ہیں، شاید اب آپ کی اِس دُنیا کو ضرورت نہیں رہی، مگر اس کے اندر، ابھی زندہ رہنے کی خواہش بدرجہ اُتم موجود تھی، اور ابھی تو وہ اپنے Soul Mate کی تلاش میں تھا، اور وہ اندر سے خوش ہو رہا تھا، کہ چلو اب اطمینان سے میں اپنے رب سے کہوں گا، (ربا میرا یار ملا دے) جو کہ میری خاموشی کی گفتگو کو بھی سمجھے، مجھے اپنے ساتھ لے کر چلے، اور میری نگاہوں کی گفتگو کا جواب دے، میری یاسیت اور میری کامیابیوں میری ناکامیوں اور میری خامیوں اور خوبیوں سمیت مجھے، قبول کرے، چاہے اس کے لئے اُسے گھر چھوڑنا پڑے، یا بن باس لینا پڑے، ابھی وہ اِسی خیال میں گم تھا، کہ اچانک جی ایم صاحب کی آواز اُس کے کانوں میں آئی عارف ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے، چل یار اُٹھ وضو کر، تو نے ابھی اذان بھی دینی ہوگی، عارف ایک دم چونکا، اور اپنی ریٹائرمنٹ کا نوٹیفیکیشن دراز میں رکھا، اور اُٹھ کر وضو کرنے کے لئے سیکشن سے باہر چلا گیا----

☆☆☆☆☆

''کشش ثقل''

نیوٹن کے تیسرے قانون کے مطابق زمین کی
کشش سے سیب درخت سے زمین پر آ گرا۔
جب میں نے نیوٹن کی یہ ایجاد پڑھی تو دل اور
دماغ میں روشنی سی ہونے لگی۔ جیسے اندھیرے
سے نکل کر کھلے میدان میں آ گیا۔
صحرا سے نکل کر ریگستان میں آ گیا
مل گئی
مل گئی
وجہ مل گئی مجھے کشش ثقل سے سیب زمین
پر آ گرا
جیسے کہ تمہاری خوبصورتی ادا اور مسکراہٹ
سے میں تم پر ان اداؤں پر آ گرا۔
واہ
میں وہ پھل تھا جو درخت یعنی اپنے مدار
سے اپنے ماں باپ سے جڑا رہا۔ پھر تمہاری
خوبیوں کی وجہ سے تم پر فدا ہو گیا۔
اور تم وہ زمین ہو جو دل کی دولت سے زرخیز
ہو گی تو مجھے خوشحال شخصیت بنا دو گی
اگر بنجر ہو تو اجاڑ دو گی
وہ
شاہ میر
شاہ میر
اور زور سے ہنسی نکل کر پورے چہرے پہ
پھیل گئی۔
(نہ حسن نہ تیرا جلوہ نہ ادا نہ تیری وفا کام آئی
اور میں اس پھل کی طرح تمہاری زمیں پر
پڑا رہا اور تمہارے جسد خاکی کے بعد ہی
زمیں پر اترا)
جب تک تم رہی
شاہ میر
شاہ میر
وہ نہ رہا جو تھا۔ شاہ میر تمہارا رہا شاہ میر
اور اس کے بعد بھی
شاہ میر کمال بن گیا

عائشہ احمد جاوید

"کشش ثقل"

کائنات میں ہر جسم دوسرے جسم کو ایک
طاقت سے اپنی جانب کھینچتا ہے۔ جو ان
کے ماسز کے حاصل ضرب کے ڈائریکٹلی
پروپورشنل اور ان کے درمیان فاصلے کے
انورسلی پروپورشنل ہوتا ہے۔
اس کو فورس آف گریویٹیشن کہتے ہیں
جس طرح نیوٹن کے اس کشش ثقل کے
قانون کے تحت سیب زمین پر آ کر گرا۔
اسی طرح میں تمہاری چاہت کے کشش ثقل
سے زمین پر آ گرا۔
نہ گرتا تو توڑ لیا جاتا۔
مگر نہ توڑنے تک یہی فخر تھا اور ناز تھا کہ
میں تو پھل ہوں۔ جو درخت پر لگا ہوا ہے۔
اور پھر جو پھل درخت کی سخت شاخ سے
جڑے ہوتے ہیں وہ یا تو ہواؤں کے زور
سے گر جاتے ہیں یا سخت دھوپ یا
بارشوں سے---
یا پھر کسی برے وقت پر
جو کسی کی ضرورت بھوک یا خواہش پر
گرتے ہیں
مجھے اس بات کی خوشی اس سیب کی طرح
رہی کہ میں زمین پر گرا۔
تمہاری چاہت کی نظر سے تمہاری نظر کی
سچائی سے
حقیقت اور ادا کی گہرائی سے گرا۔
الحمدللہ

اب اس سیب کی خوش قسمتی کہ وہ بنجر زمین پر
گرے یا آباد---
میں الحمدللہ زرخیز زمین پر گرا
جو خود کی صلاحیتوں خوبی اور سچائی اور کردار
میں مالا مال تھی۔
میں تو چوہدری شاہ میر تھا
جو خود میں بہت امیر تھا۔ ذات میں مرتبے
میں، دولت میں، طاقت میں، خود کی انا میں
مگر یہ انا اور یہ سب کچھ کام نہ آیا۔
تمہارے سامنے
تمہاری اس کشش ثقل کے آگے۔
دو ٹکے کی نکلی یہ طاقت
جب تم نے مجھے یہ کہا
کہاں کے چوہدری----؟
کونسی ہے تمہاری زمین کتنی ہے تمہاری زمین؟
اور میں نے بڑے فخر سے کہا شاہ گڑھ 7 مربع
ہے اور پورا گاؤں ہی میری ملکیت ہے۔
وہ بڑی زوردار ہنسی
کتنی دولت ہے تمہارے پاس
اور میں بلا سوچے سمجھے بنکوں اور اکاؤنٹس کی
فہرستیں اور بیلنس شیٹس کا بتانے لگ گیا۔
جیسے کہ وہ محبوب نہیں کوئی آفیسر ITO ہو۔
ہاہاہا
کہاں ہے تمہاری انا
So Called
مثلاً دوانا
جس میں دوام نہیں ہے

جس کی عمر تھوڑی ہے
اور طنزیہ ہنسی---
اور میں بڑی شان سے کہنے لگا۔
آج تک پانی کا گلاس اٹھ کر نہیں پیا۔
کسی کے آگے نہیں جھکا
اللہ کے آگے تو جھکتے ہوناں۔
اور وہ تشویش سے بولی
لاحول ولاقوۃ
کیسی بات کرتی ہو تم۔
میں نے غصے اور تعجب سے کہا۔
میں مسلمان نہیں ہوں کیا۔
(اور میں نے جواب کم اور سوال پوچھ لیا)
خیر مسلمان ہونے کا دعویٰ تو بہت بڑا ہے
اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔
تو میں نے کہا
وڈی طارق جمیل دی تی
طارق جمیل دی نئی فیصل اقبال دی ضرور واں
اور بڑے ناز سے اٹھ کھڑی ہوئی
مجبور بہت تھا اس کے آگے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔
بے بس سا ہو گیا تھا---
یہی وجہ تھی۔
بہت بڑا چوہدری ہونے کے باوجود
میرا اس کے سامنے بس نہیں چلتا تھا۔
اور نہ آج تک چل سکا ہے
آہ---وہ دن
کیسے بھلا سکتا ہوں میں
کہ جب میں نے خود کی محبت کو رشتے کا نام
دینے کے لیے بات کی تھی تو مجھے اس نے کہا
کہ پہلے میرے ساتھ چلو
میں نے کہا
کہاں
اور میں حیران سا رہ گیا
کیونکہ میں اس کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ
تو بات ہی سو بار اصرار کے بعد کرتی تھی
اور جانے کا اصرار وہ بھی اکیلی
میرے ساتھ
کافی حیران کن تھا میرے لیے
بہر حال میرے (مرحوم) ماموں کی بیٹی اور
میری ماموں زاد تھی
لہٰذا ممانی سے اجازت لینے کے بعد میں
اس کے ساتھ ہو لیا۔
وہ گہرے تعجب کی بات ہے کہ ممانی نے بھی
اصرار نہ کیا اور جاننے کا۔ کیونکہ اپنی اولاد کی
طرح وہ شروع سے ہی صابر و پر سکون تھیں۔
وضو کیا اور کالی چادر اوڑھے میرے ساتھ ہو لی
جیسے کوئی شاہ صاحب بڑی ٹھاٹھ سے اپنی
گدی پر بیٹھنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں
دائیں ہاتھ میں وہی یاقوت پتھر اور کچھ
گولڈن سی چوڑیاں پہنے چہرے پر اطمینان
کی بہار لیے میرے ساتھ ہو لی۔
راستے میں کئی بار میں نے اس سے اصرار کیا
کہ اس راستے کی اصل منزل ہی بتا دے
مگر وہ تو مجھے بس یہی کہے جا رہی تھی

جیسے میں کہوں گی گاڑی چلاتے رہو۔
جب منزل آئے گی تو خود بتا دوں گی
اور اس کے مزاج کا فیصلہ مجھے چپ کروا دیتا
لہٰذا میں کسی فرمانبردار مرید کی طرح خاموش
ہو جاتا تھا۔
کیونکہ ایک وہی تھی تو جس کے آگے میری
"میں" نہ چلتی تھی
مگر وہ یہ چاہتی تھی کہ اس "میں" کی کوئی
پرواہ نہیں
بس اس "میں" کو میں "اللہ" پاک کی
رضا میں ختم کر دوں۔ بے شک
راستے کا نشان مجھے تشویش ناک کر رہا تھا۔
کہ اچانک
شہر خموشاں کے نشان پر میں چونک گیا۔
ہیں
اور تعجب سے اُسے دیکھنے لگ گیا۔
وضو تو پہلے ہی کر کے آیا تھا۔
اور ٹوپی اس اس نے مجھے تھما دی۔
صبح کا وقت تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں
اگربتیوں کی عجیب سی خوشبو سے اس لافانی
دنیا کا احوال معلوم ہو رہا تھا۔
شاہ میر صاحب نیچے اُتر جایئے۔
اور ملکہ کی آواز میں نمی اتر آئی۔
اور آہستہ آہستہ میں قبروں کی طرف چلنے لگا۔
سب سے پہلے دادا جان کی قبر پر پھر دادی
جان، چچا رشتے دار کے بعد سب کے لیے
دعائے خیر کرنے لگا۔

قبروں پر فاتحہ اور پھول بچھانے کے بعد
ایک دربار کے اندر چارپائی پر بیٹھ گیا۔
تب محترمہ نے ارشاد فرمایا
یہ ہے چوہدری ارشاد کی قبر
جس نے وراثت میں زیادہ حصہ ہتھیانے
کے لیے سگے بھتیجے کو مار دیا۔
اس کے جانے کے بعد ---
شریکے اور اولاد مال کھا رہے ہیں
ساتھ ہی محروم بھائی کی اولادیں قاتل قاتل
کہتے کہتے خاموش ہو گئیں ہیں
اور یہ ہے اماں منظوراں کی قبر جس سے
ساری زندگی بہوؤں سے اپنی ساس کے ظلم
کا بدلہ لیا۔
جنہوں نے ساس کی تدفین کے بعد اس
کے گھر کا رُخ نہ کیا۔
اور اس کے گھر کو خالی چھوڑ کر چلی گئیں۔
یہ ہے ملک نادر کی قبر جس نے اپنی انا کی
جنگ میں بیٹے کو اپنی مرضی کی شادی نہ
کرنے دی تو اس کے بیٹے نے زہر کھا لیا۔
اس صدمے سے ملک نادر کو ہارٹ اٹیک ہو
گیا۔
باپ بیٹے دونوں کی قبریں برابر میں ہیں۔
اور اس کے بعد ایک لمحے کو تو میں سکتے
میں آ گیا
کہ اب بولنے کو ----
کچھ رہ نہ گیا تھا۔
اس کے بعد ایک ٹھنڈی آہ لیتے ہوئے اس

نے مجھ سے کہا۔
اچھا اب تم یہ بتاؤ تم کہاں کے چوہدری ہو
-----؟
اِسی کسی کہانی کے کردار کے ---؟
یا اپنی انا ضد اور جھوٹے سٹیٹس کے ---؟
جس کے ٹھاٹھ باٹھ اور دوہرے معیار کے
پیچھے کچھ رہ نہیں گیا۔
اور اس کے سوالیہ نظریں میری آنکھوں کے
جواب کا تعاقب کر رہی تھیں
اور اب میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔
سوائے ندامت سے احساس اور جھکے ہوئے
سر کے
آہ---
آؤ گھر واپس چلتے ہیں
اس میں بمشکل یہی کہہ پایا
چلو کچھ تو بولے
اور اس کی مسکراہٹ میں فاتحانہ خوشی تھی۔
اور اطمینان بھی--
آج دس دن بعد جب---
اس کی قبر کے سرہانے کھڑے جب میں
نے فاتحہ پڑھی
تو دائیں طرف میرا بڑا بیٹا سکندر اور بائیں
طرف عبداللہ کھڑے تھے
بابا۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟
آپ کو مما یاد آ رہی ہے؟
ہاں---
میں صرف اتنا ہی کہہ پایا

اس معصوم کے اس معصوم سوال پر
آج نہ چھپایا گیا مجھ سے
اور نیچے بیٹھ گیا
اور سکندر زور سے میرے گلے سے لگ گیا۔
وہ اللہ تعالیٰ کے پاس کیوں چلی گئیں؟
بیٹا آپ کی مما اللہ پاک کو بہت پیاری تھیں
اس لیے انہوں نے انہیں جلدی بلا لیا تو پھر
مجھے بھی بلا لیں
میں تمہیں پیارا اللہ پاک کا
اور میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
نہ بیٹا---؟
نہ
ایسی باتیں نہیں کرتے۔
اور میں اسے بے تحاشا پیار کرنے لگا۔
اور عبداللہ ماں کے ختم پر تقسیم شدہ نمک
پارے کھا رہا تھا۔
اور مسلسل کہہ رہا تھا
بابا---
یہ والے نمک پارے مجھ سے نہیں کھائے
جاتے
شاید ان کا (Taste) ذائقہ کچھ اور ہے
آپ مجھے چاکلیٹ دلائیں
اس کو کھاتے ہوئے مما کی تصویر اور آواز
سنائی دیتی ہے
اور رونا آ جاتا ہے
اور اس کی معصوم آنکھوں میں ادھورے
سوال اور اداسی تھی

اور اسے میں نے گود میں لے لیا
کیونکہ
ملکہ کا کہنا تھا میرے بچوں کو زمین پر زیادہ
مت چلانا
گر نہ جائیں
کیونکہ جب میں نہ ہوں گی تو ان کو کون
اٹھائے گا؟
میری روح تڑپے گی۔
اور اسی اثنا میں گھر سے اس کی دادی کا فون
آ گیا
شاہ میر
کیسے ہو---
بچے تو نہیں رو رہے
انہیں گھر لے آؤ
پچھلی بار بھی ملکہ کے سالانہ ختم پر ان کو بخار
ہو گیا تھا۔
زیادہ دکھی کر دیتا ہے
جی امی۔
ایسے ہی ہے۔
اور آواز بھرا آئی
کیا ہوا
اور میرے ادھورے جواب کو میری ماں کی
دور اندیشی نے بھانپ لیا
اور فون رکھ دیا۔
کہ اسی اثنا اور دکھ کی کیفیت میں راستے
میں آم کے درخت سے ایک آم گرا
تو سکندر فوراً اُسے اٹھا لیا
اور اسے صاف کرنے لگا
بابا جی
یہ آم میں گھر لے جاؤں
جی
مجھے اس امر کے پیچھے ملکہ کی کہی ہوئی باتوں
کی گونج آنے لگی۔
کشش ثقل
نیوٹن کا نظریہ
وہ تو کہتا تھا پھل، مادہ، چاند، سورج،
ستارے
کشش ثقل کے ذریعے ایک دوسرے کے
قریب آتے ہیں
تم شکر کرو
کہ تم جس زرخیز زمین پر گرے ہو
وہ مسلمانوں کی زمین ہے
اسلام کی زمین ہے
روحانیت کی زمین ہے
ایمان کی "کشش ثقل" اس میں داخل
ہوتے ہو
بے شک
تم صحیح کہتی تھی
اور میں مسکرایا
اور دونوں بیٹوں کو اپنے گلے سے لگا لیا۔
اور گھر کی طرف روانہ ہوا
ایک نئی کشش ثقل کی طرف

☆☆☆☆☆

کرب

جاڑا اپنے جوبن پر تھا ہر طرف سرد ہوا کے جھونکے پتوں کی پٹ بھڑ اور بادل بارش اور سورج نے آنکھ مچولی کا سماں باندھ رکھا تھا یاسمین اپنے گھر میں موجود تھیں اور چولہے پر ہنڈیا چڑھا کر بیٹے کو گود میں لیے اپنے مجازی خدا کی منتظر تھی۔ یاسمین کے تین بچے تھے سب سے بڑا بیٹا اور پھر بیٹی اور چھوٹا بیٹا جو ابھی کچھ ماہ پہلے پیدا ہوا تھا جو اس کی گود میں لیٹے دودھ پی رہا تھا۔

یاسمین کا شوہر ایک سرکاری ملازم تھا اور یاسمین اپنے شوہر کی نہ صرف تابعدار اور فرمانبردار تھی بلکہ شادی کے بعد اُسے چاہنے بھی لگی تھی اس لئے ان دونوں کی زندگی خوشگوار ماحول میں بسر ہو رہی تھی سالن پک جانے کے بعد یاسمین نے اپنے بیٹے کو گود سے اتارا اور روٹی بنانے کے لیے چولہے کی لکڑیاں درست کرنے لگی یاسمین جب روٹی بنانے سے فارغ ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سامنے باہر دروازے سے اس کا شوہر اس کی منجھلی بیٹی کو اٹھائے آ رہا تھا۔ یاسمین نے خوش ہو کر ایک دلفریب مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ شوہر کے آنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ منہ دھوئے بچوں کو آواز لگائی اور شوہر کیلئے پانی کا گلاس بھر کر لے گئیں یاسمین کے شوہر نے انتہائی سرد مہری سے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اپنے منہ سے نسوار نکالی اور کلی کر کے بچا ہوا پانی اپنے ہاتھوں پر ڈال دیا۔ یاسمین سالن اور روٹی لے آئی جسے اس کے شوہر نے خاموشی سے کھانا شروع کر دیا کھانے کے دوران یاسمین اپنے شوہر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی گھر کا حال سالن کا ذائقہ، موسم کی آنکھ مچولی، بچوں کی لڑائی اور سردی کی شدت جیسے موضوعات پر وہ بولتی رہی مگر ان تمام باتوں کا اس کا شوہر صرف ہاں، ہوں میں جواب دیتا رہا دن رات ایسے ہی روزمرہ کے کاموں اور مصروفیات میں بسر ہو رہے تھے کہ ایک دن عصر کے وقت جب باہر صحن کا دروازہ کھلا تو اس نے دیکھا کہ اس کا چھوٹا بھائی اور اس بھائی سے بڑی بہن اس کے گھر میں داخل ہو رہے تھے یاسمین کی بہن نے منہ سے نقاب ہٹایا اور آ کر بڑی بہن سے ملی بھائی نے بھی یاسمین کو سلام کیا۔ اور گھر میں بچوں نے اپنی خالہ اور ماموں سے حال چال پوچھنے کے بعد چھیڑ خانیاں شروع کر دیں۔ یاسمین نے اپنی بہن سے اپنے دوسرے بہن بھائیوں اور خاص کر اپنی ماں کا احوال معلوم کیا یاسمین کی بہن نے بتایا کہ سردی کی شدت

محمد شفیق

کی وجہ سے امی کو کچھ کھانسی اور نزلہ رہتا ہے ویسے وہ باقی تندرست ہیں اور کھانسی وغیرہ کی بھی دوائی لے رہی ہیں بھائی اور بہن کو چائے وغیرہ پلانے کے بعد انہیں اپنے کمرے میں لے گئی اور ان کے لئے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنے لگی- یاسمین کا شوہر جب شام کے بعد گھر آتا ہے تو اپنے سالے اور سالی کو دیکھ کر خوشی اور حیرانگی کا ملا جلا اظہار کرتا ہے اور رات کو سارے مل کر کھانا کھاتے ہیں-

اور یاسمین کا شوہر اپنے بچوں سے کچھ گپ شپ کرنے کے بعد باہر چلا جاتا ہے رات گئے وہ واپس آتا ہے تو یاسمین جاگ رہی ہوتی ہے جو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس سے خود ادھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہے صبح ناشتے کے وقت جب سب گھر والے ایک چولہے پر بیٹھتے ہیں اور یاسمین کی بہن اپنی بڑی بہن کا ناشتہ بنانے میں ہاتھ بٹاتی ہے تو اس کا شوہر اس کی بہن کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر کچھ وقت کے لئے دیکھتا ہی چلا جاتا ہے جب یاسمین اس طرف دیکھتی ہے تو وہ آنکھیں پھیر لیتا ہے مگر جب یاسمین اس منظر سے غافل ہوتی ہے تو وہ دوبارہ اس کی بہن کو گھورنے لگ جاتا ہے یاسمین کے بچے بھی خالہ اور ماموں سے گھلے ملے ہوئے تھے اور یاسمین بھی اپنے شوہر کا بدلہ ہوا رویہ دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے جو شوہر کل تک سنجیدگی کی علامت بنا ہوا تھا وہ اب نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ اپنی سالی اور سالے سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا-

موسم نے پھر انگڑائی لی اور آسمان پر بادل ابھرے اور پھر پھیلتے ہی چلے گئے اور بادلوں کے گرجنے کے بعد اچانک موسلادھار بارش شروع ہو جاتی ہے- یاسمین اپنی بہن اور بھائی کو موسم کی صورت حال دیکھ کر روک لیتی ہے شام کو کھانے پر یاسمین کے شوہر کی اپنی سالی سے کافی حد تک آزادی ہو جاتی ہے شام کے وقت جب بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے تو یاسمین کا شوہر اپنی سالی کو اس وقت اپنی محبت کی دعوت دیتا ہے- جب یاسمین کا بھائی اپنے بھانجے کے ساتھ قریبی دکان پر مٹی کا تیل لینے گئے ہوتے ہیں اور یاسمین باتھ روم میں ہوتی ہے یاسمین کی بہن اپنے بہنوئی سے غیر متوقع باتیں سن کر پہلے تو کچھ حیران اور پریشان ہوتی ہے مگر پھر اپنی بہن کو خوش دیکھ کر اور بھانجوں کے پیار بھرے ماحول میں وہ بھی اپنے بہنوئی سے محبت کا اقرار کر دیتی ہے جب یاسمین باتھ روم سے واپس آتی ہے تو پورا کمرہ ہنسی کی گونج سے گونج رہا ہوتا ہے یاسمین بھی اپنے شوہر اور اپنی بہن کو باتیں کرتا دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے کہ جو شوہر بھی ہاں ناں کے علاوہ بولتا نہیں تھا آج چہک چہک کر اپنی سالی بیوی اور بچوں سے بول رہا تھا یاسمین نے لیمپ جلایا اور چائے بنانے کی اپنے شوہر کی فرمائش کو پورا کرنے لگی اس دوران اس کے ادھر اُدھر جانے یا سامان اٹھانے کے وقفے میں اس کے شوہر اور اس کی بہن کی آنکھوں کے درمیان کئی محبت کے مکالمے ادا ہو گئے- اگلے دن جب اس

کے بھائی اور بہن کے جانے کا پروگرام بنتا ہے تو یاسمین کا شوہر اس سے کہتا ہے کہ اپنی بہن اور بھائی کو ایک دو دن کے لئے مزید روک لو کیونکہ ایک تو ان کے سکولوں کی سردیوں کی چھٹیاں ہیں اور دوسرا تم دیکھ نہیں رہی کہ بچے ان کے ساتھ کتنے خوش ہیں یاسمین تو درحقیقت شوہر کا رویہ دیکھ کر خوش ہو رہی ہوتی ہے اور اس کا شوہر کچھ اور دیکھ کر خوش تھا اپنے شوہر کی فرمائش پر یاسمین اپنی بہن اور بھائی کو یہ کہہ کر روک لیتی ہے کہ تمہارے سکولوں کی ویسے بھی چھٹیاں ہیں اور گھر جا کر تم نے کیا کرنا ہے تمہارے بھانجے اور بھانجی تمہارے ساتھ بہت خوش ہیں تو ان کے لئے ایک دو رات مزید رک جاؤ خیر ہے اماں کو میرا کہہ دینا اندر سے تو یاسمین کی بہن بھی یہی دُعا مانگ رہی ہوتی ہے جب ان کے ٹھہرنے کا پروگرام بنتا ہے تو یاسمین کا شوہر نہ صرف مزید سودا سلف لے آتا ہے بلکہ اپنے بچوں کا بہانہ بنا کر کچھ مٹھائی اور فروٹ بھی لے آتا ہے اگلے دو دنوں میں صبح، دوپہر شام اور رات کوئی ایک وقفے میں یاسمین کے شوہر اور اس کی بہن نے اپنے نئے رشتے کو مزید تقویت بخشی آخر مہمانوں نے جانا تھا اور چلے گئے۔ مگر یاسمین کے شوہر میں اب کافی بدلاؤ آچکا تھا جسے یاسمین جیسی ان پڑھ اور سادہ مزاج گھریلو خاتون نہ سمجھ سکی بلکہ وہ تو اسے اپنی شوہر پرستی کا انعام سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ چند دنوں بعد یاسمین کا شوہر اس کے والدین کے گھر لے جاتا ہے جہاں پر پھر اس کے شوہر اور اس کی بہن کے دوران کئی آنکھ مٹکے ہوتے ہیں سسرال والے نہ صرف یاسمین کی زیادہ آنے جانے سے خوش تھے بلکہ وہ اس کے شوہر کے بدلے ہوئے رویے سے بھی بہت خوش تھے۔

کچھ وقت گزرتا ہے تو ایک دن اس کا شوہر منہ لٹکائے گھر آتا ہے اور یاسمین کے پوچھنے پر بتاتا ہے میرے بھائی مل کر یہ گھر تقسیم کر رہے ہیں اور ان کمروں کا گرا بھی رہے ہیں یاسمین کہتی ہے تو پھر آمیں پریشانی کی کیا بات ہے آپ کی نوکری ہے جگہ تقسیم ہو جائے گی تو ہم الگ اپنا گھر بنا لیں گے یاسمین کا شوہر کہتا ہے یہ پریشانی کی بات نہیں ہے مگر ابھی ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ہم نیا مکان تعمیر کر سکیں اس بات پر دونوں سوچنا شروع کر دیتے ہیں اور کافی سوچ بچار کے بعد یاسمین کا شوہر کہتا ہے کہ کیوں نہ تم اپنی ماں سے بات کرو ان کا گھر کافی بڑا ہے اور جب تک ہمارا گھر نہیں بن جاتا ہم ان کے گھر رہ جائیں ویسے بھی تو ان کے دو کمرے خالی پڑے ہیں ایک کمرہ کچھ وقت کے لیے ہمیں دے دیں یاسمین خوش ہو کر کہتی ہے میں آج ہی جا کر اپنی ماں سے بات کرتی ہوں اور یاسمین کی ماں تو گویا ان کے انتظار میں ہی بیٹھی تھی اپنی ماں سے اجازت ملنے کے بعد یاسمین اور اس کا شوہر آسانی سے اپنے سسرال میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔

اب ایک گھر ہو جانے کے بعد یاسمین کے

شوہر اور اس کی بہن کے درمیان قربتیں مزید بڑھ جاتی ہیں سب لوگ اکٹھے رہ کر بڑے خوش وخرم ہیں یاسمین اپنی جگہ، اس کی ماں اپنی جگہ، بچے اپنی جگہ اور سالی، بہنوئی اپنی جگہ، حالات دن بدن محبت سے لبریز ہوتے جاتے ہیں صبح صبح جیسے یاسمین کا والد نماز کو جاتا ہے تو یاسمین کی بہن منہ اندھیرے صحن میں آجاتی ہے اور یاسمین کا شوہر بھی اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آجاتا ہے دونوں نہ صرف پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی خوب کرتے ہیں باتوں باتوں میں یاسمین کا شوہر اپنی سالی سے کہتا ہے کہ کل جب تمہارا والد نماز پر جائے تو تم اپنے کمرے سے ہمارے کمرے میں آجانا یاسمین کی بہن جو پہلے ہی اپنے بہنوئی پر اپنا تن من آبرو قربان کر چکی ہوتی ہے وہ اس بات پر سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اگلے دن یاسمین کی بہن اس کے شوہر کے بستر کی شریک بھی بن جاتی ہے اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے اور یاسمین کی آنکھوں میں مسلسل دھول جھونکی جاتی رہتی ہے کہ ایک دن اس کا شوہر اسے کہتا ہے کہ کیوں نا اپنی بہن کو اپنے کمرے میں سلا دیا کرو تمہارا بیٹا رات کو روتا ہے اور پریشان کرتا ہے اسی طرح ایک بچہ اپنی خالہ کے ساتھ سوتا رہے گا یاسمین اس بات کو اپنی ہمدردی سمجھ کر اپنی بہن سے کہتی ہے تم آج سے ہمارے کمرے میں سونا تمہاری بھانجی تمہارے ساتھ سوئے گی وہ اکیلے میں مجھے پریشان کرتی ہے اب تو گویا یاسمین کے شوہر اور اس کی بہن کے لئے عید کا چاند نمودار ہو جاتا ہے اور دونوں یاسمین کی نیند تک جدا رہتے ہیں ایک دن یاسمین کا جب چھوٹا بیٹا پیٹ کے درد سے روتا ہے تو یاسمین اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ مسلسل رو رہا ہوتا ہے یاسمین اٹھ کر جب بلب جلاتی ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس کی بہن اپنی چارپائی پر نہیں ہوتی۔ اگلے ہی لمحے جب اس کی نظر اپنے شوہر کی رضائی پر پڑتی ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے کہ اس کی بہن کی اوڑھنی اس کے شوہر کی رضائی سے نیچے لٹک رہی ہوتی ہے وہ بھاگ کر رضائی کا پلو الٹ دیتی ہے اور پھر اس کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہیں جو نجانے کتنے عرصے سے چلا آرہا تھا یاسمین چیخنا شروع کر دیتی ہے اس کا شوہر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اس کی بہن اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اگلی صبح یاسمین سارا منظر اپنی ماں کو بتا دیتی ہے یاسمین کی بہن سکول سے واپس آتی ہے تو ماں اس کو کچھ واجبی سی نصیحتیں کرتی ہے مگر اس کی بہن اپنی محبت پر بضد ہوتی ہے اتنا کچھ ہو جانے اور ہر طرف سے منع کرنے کے باوجود بھی ایک دن صبح کے وقت جب یاسمین کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ فوراً کمرے سے باہر صحن میں دیکھتی ہے جہاں آج بھی اس کی بہن اور شوہر صبح صادق کے اندھیرے میں مل رہے ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

چھپن چھپائی [مائیکرو فکشن]

سلمان یوسف سمیجہ

ان بوڑھی آنکھوں میں آج بھی انتظار موجود تھا، اسے پتہ تھا کہ وہ نہیں آئے گا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ایک موہوم سی امید دل میں جاگ اٹھتی کہ وہ آئے گا کیونکہ امید پہ دنیا قائم ہے۔

بسترِ مرگ پر پڑے پڑے یونہی اس کا دماغ ماضی کی جانب سفر کرنے لگا۔

****

"ابو! آئیں، چھپن چھپاء کھیلیں!" بیزار بیٹھا سات سالہ عالم اپنے ابو سے بولا۔ "ہاں بیٹا چلو، کھیلتے ہیں!"

عالم خوشی سے اچھل پڑا۔

"ابو! پہلے میں چھپوں گا، پھر آپ مجھے ڈھونڈیں گے"۔ عالم کی بات پر ابو نے سر ہلا دیا۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دس تک گنتی گننے لگے، جبکہ عالم اپنے کمرے کے پلنگ کے نیچے چھپ گیا۔ وہ دس تک گنتی گن چکے تو عالم کو ڈھونڈنے لگے۔

انہوں نے پردے کے پیچھے دیکھا، عالم موجود نہیں تھا، صوفوں کے نیچے دیکھا، وہاں بھی وہ نہیں ملا، کچن میں گئے کہ شاید وہاں چھپا بیٹھا ہو، مگر وہاں بھی وہ نہیں تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" کچن میں ہانڈی پکاتی امی نے پوچھا۔

"عالم کو، ہم چھپن چھپائی کھیل رہے

ہیں نا!"

وہ بولے اور وہاں سے نکل گئے۔ انہوں نے اسے بہت سی جگہوں پر ڈھونڈا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

"عالم بیٹا! کہاں ہو؟" انہوں نے تھک ہار کر بلند آواز میں پوچھا۔

"دیکھو بیٹا، بہت دیر سے تم چھپے بیٹھے ہو، اب باہر آجاؤ، میں ہار مانتا ہوں"۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ عالم جلدی سے فاتحانہ انداز میں اپنے کمرے کے پلنگ کے نیچے سے باہر نکل آیا۔

"کہاں چھپے بیٹھے تھے؟" انہوں نے عالم کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔

"میں تو اپنے کمرے کے پلنگ کے نیچے چھپا بیٹھا تھا، مگر آپ تو مجھے ڈھونڈ ہی نہیں سکے، یاہووووو......!!!" عالم فاتحانہ انداز میں چلایا، وہ ہنستے ہوئے اس کا کندھا تھپکنے لگے۔

"میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ اللہ جانے، تم کہاں چلے گئے!" وہ عالم کو پیار بھی کر رہے تھے، عالم ان کا عالم تھا، ان کی دنیا تھی، ان کا سب کچھ تھا۔ جب عالم کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرتے تو وہ بھی خوش ہو جاتے، عالم پریشان ہوتا تو وہ بھی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ عالم کو کوئی چوٹ لگتی تو درد انہیں ہوتا۔ وہ عالم کے لیے ٹھنڈا سایہ تھے، جبکہ عالم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ عالم ان کی زندگی اور ان کے گھر کا اُجالا تھا۔

ہر ماں باپ کی طرح عالم کے ماں باپ بھی اسے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ جب عالم سولہ سال کا ہوا تو اس کی امی کو کینسر ہو گیا اور وہ کچھ ہی دنوں بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ عالم کے ابو نے اس ڈر سے دوسری شادی نہیں کی سوتیلی ماں عالم کے ساتھ برا سلوک کر سکتی ہے۔ باپ تو وہ پہلے ہی تھے، اب وہ اس کے لیے ماں بھی بن گئے تھے۔ وقت کی گاڑی چلتی رہی اور ایک دن عالم بڑا آدمی بن گیا۔

****

"میرے بیٹے عالم! تم کیوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟" بوڑھا وجود روتے ہوئے بولا۔

"مم.....میرا بیٹا اب بھی میرے ساتھ چھپن چھپائی کھیل رہا ہے، وہ مجھے کہیں نہیں مل رہا، کہیں بھی نہیں۔ کاش! وہ پلنگ کے نیچے سے نکل کر مجھے خوش کر دے۔ وہ...وہ مجھے کہیں نہیں مل رہا، میری آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ کاش! اسے پتہ چل جائے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مم..میرا بیٹا اب بھی میرے ساتھ چھپن چھپائی کھیل رہا ہے، مجھے ملتا ہی نہیں، اللہ جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے؟ اس کے بچپن سے لیکر جوانی تک بھی یہ کھیل جاری ہے، بیٹا! میں ہار مان چکا ہوں، اس سے پہلے کہ زندگی کی بازی بھی ہار بیٹھوں تم فاتحانہ انداز میں پلنگ کے نیچے سے نکل آؤ"۔ بوڑھا وجود کمزوری آواز میں اپنے عالم کو پکار رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

غزل

مری جاں اُنہیں کون نبیڑے
مری رُوح میں لاکھ بکھیڑے

نہ وہ میں ، نہ وہ تُو نہ عدو وہ
نہ وہ ہیر رہی ، نہ وہ کھیڑے

سفر اسم تو گونج چکا ہے
مرے تن ! تجھے کیا کوئی چھیڑے

مری سانس اُداس سہاگن
درجاں ترے پَٹ کوئی بھیڑے

وہی دُھن وہی رو وہی چکّر
وہی ایک گلی وہی گیڑے

کوئی بات کو بات نہ جانے
کوئی بال کی کھال اُدھیڑے

کوئی پیار کو پیار نہ جانے
"کتھے لگ گئے عین اویڑے"

ترے نام پہ خالد احمد
کوئی منہ کوئی ناک سکیڑے

خالد احمد

غزل

یہاں تو پیاس کے مارے زباں نکل آئے
پڑے ہیں سوچ میں یہ ہم کہاں نکل آئے

مسافتیں بھی تماشے عجب دکھاتی ہیں
چلو تو پاؤں میں آب رواں نکل آئے

ہم اختصار کو تفصیل کر رہے ہیں بہت
بس ایک حرف سے سارا جہاں نکل آئے

میں کس قماش کے وہم و گماں میں رہتا ہوں
بھری بہار کو دیکھوں خزاں نکل آئے

دعا تھی یار کی بستی میں امن قائم ہو
ذرا سی بات پہ تیر و کماں نکل آئے

غزل کی ایسی بلندی پہ ناز کرتا ہوں
زمیں کے شعر سے جب آسماں نکل آئے

غموں کو راز میں رکھنا محال ہے ثاقبؔ
جو زخم باندھ کے رکھوں دھواں نکل آئے

آصف ثاقب

غزل

سب کچھ ہوتے، بک جاتے ہیں
لوگ یہ کیسے، بک جاتے ہیں

ٹوٹے تو وہ گھر نہیں رہتا
سب کے حصّے بک جاتے ہیں

دل منڈی میں سودے، اکثر
بِن گاہک کے بک جاتے ہیں

لیکن تم تو ہم سے کب تھے
مانا، ہم سے، بک جاتے ہیں

وقت پڑے تو دیکھا ہم نے
پیچھے والے، بک جاتے ہیں

کبھی کبھی تو ایک ادا پر
پورے میلے، بک جاتے ہیں

گاہک وہ ہو تو آنسو بھی
ہنستے ہنستے، بک جاتے ہیں

سچ تو پھر بھی سچ رہتا ہے
لِکھنے والے بک جاتے ہیں

خوشبو، دیکھتی رہ جاتی ہے
رنگ دھنک کے، بک جاتے ہیں

کون خریدے، اُن کے غم کو
جن کے بچّے، بک جاتے ہیں

محنت کش کے ہاتھ بکیں، تو
خواب بھی اُس کے بک جاتے ہیں

بات تو ساری قیمت کی ہے
اچھے اچھے، بک جاتے ہیں

امجد اسلام امجد

سب کو گاہک مل جاتا ہے
سب کے سودے بک جاتے ہیں

کیا کیا مہنگے لوگ یہاں پر
کتنے سستے بک جاتے ہیں

بچّے ، اُن کو چھو نہیں پاتے
اور کھلونے ، بک جاتے ہیں

سچ کا گاہک اک بھی نہیں ہے
لاکھوں دھوکے ، بک جاتے ہیں

چپکے چپکے ، زیور ماں کے
اک اک کر کے بک جاتے ہیں

دیواریں ، دروازے ، کیا ہیں
گھر کے نقشے بک جاتے ہیں

امجدؔ جن کو بکنا ہو وہ
کسی بہانے بک جاتے ہیں

غزل

سبھی حیرت میں ڈوبے سوچتے تھے
جو حال اپنا ہے کس کے فیصلے تھے

کوئی بھی راہ سے واقف نہیں تھا
بس اندازے سے چلتے جا رہے تھے

تری لہجے بدلتی گفتگو سے
دلوں میں وہم کیا کیا جی اٹھے تھے

ملا درد آشنا شانہ نہ کوئی
گلے خود اپنے لگ کر رو لیے تھے

زمیں اندر دراڑیں آ گئی تھیں
ستارے آسماں سے گر پڑے تھے

یہ کس کا غم قیامت رو رہی تھی
یہ کس کے درد میں دریا رکے تھے

کبھی چاہت ہماری چارسُو تھی
ہماری راہ رستے دیکھتے تھے

یہ کس نے خال و خد بدلے ہمارے
ہم اپنے آپ پر جانے لگے تھے

ہمیں واپس وہیں لایا گیا ہے
بہت آگے جہاں سے جا چکے تھے

اب اڑتی دھول میں دکھتا نہیں کچھ
کب اپنے دن بھی کالی رات سے تھے

لٹے ہیں اپنے ہاتھوں آپ عالی
سرابوں کے تعاقب میں گئے تھے

جلیل عالی

غزل

یہ نگاہِ شوق کا ذکر ہے، دلِ بے قرار کی بات ہے
میں زباں سے کیسے بیاں کروں جو فسونِ یار کی بات ہے

جو ہے شام تو مری راہ میں ہے چمک سی چشمِ سیاہ کی
جو ہے صبح تو مرے روبرو رُخِ زرنگار کی بات ہے

جو برنگ ساز مچل گئی، جو بطرزِ رقص بدل گئی
جو زبانِ شعر میں ڈھل گئی، غمِ ہجرِ یار کی بات ہے

یہ خیال و خواب کی جنتیں، یہ فسونِ شوق کی ساعتیں
تری دید کی ہیں بشارتیں، ترے انتظار کی بات ہے

میں بھلا دوں اُس کے خیال کو، میں مٹا دوں عکسِ جمال کو
میرے دوستو! یہ بھلا کہاں مرے اختیار کی بات ہے

یہ عجیب عہد ہے، موسموں کا بھی رنگ روپ بدل گیا
یہ عجب ہے فصلِ بہار میں بھی غمِ بہار کی بات ہے

یہاں سب کا حال خراب ہے یہاں سب کے سر پہ عذاب ہے
جو ملا اُسی کی زبان پر، غمِ روزگار کی بات ہے

جمیل یوسف

غزل

آنے کے لیے آ، فقط آنے کے لیے آ
اے دوست کسی روز نہ جانے کے لیے آ

تنہائی میں سنسار ہے سُنسان بیابان
سُنسان بیابان بسانے کے لیے آ

خلوت کسی تدبیر سے جلوت میں بدل دے
تقدیر کو آئینہ دکھانے کے لیے آ

سینے میں کوئی آگ ہے بھڑکی ہوئی، یہ آگ
گلزار و سمن زار بنانے کے لیے آ

رنجیدہ و مہجور نہ خود ہو نہ مجھے کر
آغوشِ محبت میں سمانے کے لیے آ

تو حُسن ہے مَیں عشق ہوں، تو عشق ہے مَیں حسن
ہر فاصلہ، ہر فرق مٹانے کے لیے آ

کیا تُو ہے شعورؔ اپنے ہی جیسوں سے بھی تائب
پینے نہ سہی، ملنے ملانے کے لیے آ

انور شعور

غزل

ہوں آب دیدہ کیوں نہ پھر چراغ میرے شہر کے
گواہ چشم دید ہیں یہ تیرگی قہر کے

سمجھ نہ ان کو جھریاں مری جبیں پہ وقت نے
بنا دیے ہیں راستے جو آنسوؤں کی نہر کے

زمین اپنے پاؤں سے سَرکتی دیکھنی ہو گر
ذرا سی دیر ساتھ چل کے دیکھ ماہ و مہر کے

عدالتوں کی آنکھ سے اتار کالی پٹیاں
کہ دے رہی ہیں مے انہیں جو مستحق تھے زہر کے

خرام دیکھ کر کسی کا بحر کھا رہا تھا بل
نکل رہی تھی منہ سے جھاگ ساحلوں پہ لہر کے

بدل گئے ہیں عاشقوں کے بھی طریقِ واردات
مزاج اور ہو گئے ہیں گر بتانِ شہر کے

تمھارا کیا بنے گا جانے آگے جا کے سرحدی
کہ عشق میں تو دین کے رہے ہو تم نہ دہر کے

راحت سرحدی

غزلیں

قید ہے حُسنِ بام و در میں کوئی
ویسے رہتا نہیں ہے گھر میں کوئی

آتی رہتی ہے گھنگروؤں کی صدا
سایہ رہتا نہ ہو شجر میں کوئی

منزلِ شوق ! تھام لے بڑھ کر
رہ نہ جائے ترے سفر میں کوئی

کام اِتنے اور ایک جانِ عزیز
کیا کرے عمرِ مختصر میں کوئی

چشم و دل کا معاملہ ہے عجب
خواب میں کوئی اور خبر میں کوئی

خاور اعجاز

مجھے تو پرچم سنبھالنے کی پڑی ہُوئی ہے
عدو کو حسرت نِکالنے کی پڑی ہُوئی ہے

دعا کرائی گئی ہے مسجد میں بارشوں کی
سو ہر پرندے کو آلنے کی پڑی ہُوئی ہے

وہ حیلہ جُو کب کسی کے کہنے سے مانتا ہے
اُسے تو عادت ہی ٹالنے کی پڑی ہُوئی ہے

یہ کھیل بستی میں کیسا مقبول ہو رہا ہے
ہر اک کو پگڑی اُچھالنے کی پڑی ہُوئی ہے

نہیں غرض پھُول پھل سے، تاجر مزاج کو بس
شجر کو لکڑی میں ڈھالنے کی پڑی ہُوئی ہے

غزل

معافی مانگ کے سب کو معاف کر کے بھی
کبھی تو دیکھنا ایسے طواف کر کے بھی

دعائیں مانگنا پھر دیکھنا اثر ان کا
عناد و بغض سے سینے کو صاف کر کے بھی

میں اس کے کہنے پہ مجرم ہوں اور وہ دودھوں دھلا
ہے اپنے جرم کا خود اعتراف کر کے بھی

جنہیں ہے اُگنا انہیں اُگنا ہے بہر صورت
پہاڑ چیر کے اس میں شگاف کر کے بھی

وہ اپنے حق میں نہ ہموار کر سکا رائے
تمام شہر کو میرے خلاف کر کے بھی

نہ زنگ اتاریں تو اکرمؔ یہ کب اترتا ہے
یہ دل کہ ویسا ہی ہے اعتکاف کر کے بھی

اکرم ناصر

غزل

جب بھی پیڑوں پہ بور آتا ہے
نیتوں میں فتور آتا ہے

آپ کی چکنی چپڑی باتوں میں
کوئی کب تک حضور آتا ہے؟

تجربہ ایک عمر مانگتا ہے
رفتہ رفتہ شعور آتا ہے

اب اسی زعم میں نہیں رہنا
وہ منانے ضرور آتا ہے

مجھ سے ملنے کو اِک ستارۂ جاں
نیم شب کتنی دور آتا ہے

ہوش اڑنے لگے ہیں جانِ انیسؔ!
کوئی دم کوہ طور آتا ہے

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

غزل

پورا کوئی جب شہر کے معیار پہ اترا
تصویر میں ڈھل کر در و دیوار پہ اترا

احساں اسی مشعل کی بغاوت کا ہے جس پر
ماحول شبِ تار سے انکار پہ اترا

کانٹوں کو شفق رنگ کیا اس کے لہو نے
یوں آبلہ پا وادیِ پُرخار پہ اترا

پتھر میں نہاں کرم سے پانی کی تہوں تک
چاہے تھا جہاں رزق طلبگار پہ اترا

غفلت کے سوا کچھ نہ ملا سوئے ہوؤں کو
آگاہی کا موسم دلِ بیدار پہ اترا

خاموش ہے صابر نہیں محروم زباں سے
ہو جاؤ گے حیراں اگر اظہار پہ اترا

قاتل کی یہ کوشش تھی کہ گلزار وہ روئے
مقتول مگر ہنستے ہوئے دار پہ اترا

گلزار بخاری

غزل

الفاظ پہلے بعد میں شوشا بنایا ہے
کردار جس طرح کا تھا ویسا بنایا ہے

جب چاہوں امتحان میں ہوں خود کو ڈالتا
کشتی بھی اپنی، اپنا ہی دریا بنایا ہے

اپنی خوشی سے میں نے چنے اپنے راستے
اپنی خوشی سے اپنا زمانہ بنایا ہے

اپنی خوشی سے دشت کی تھا سیر کو گیا
جو بھی ہے رنگ میرا وہ میرا بنایا ہے

اِک نظم سے بنایا گیا یہ جہان ہے
غم پہلے ہیں بنائے تو گریہ بنایا ہے

گرداب سب کے سب مرے اپنے بنائے ہیں
اِن پانیوں کے بیچ ہی رستہ بنایا ہے

عظمیؔ عجیب کام ہی کرتا ہے اِن دنوں
پھر اُس نے آسماں پہ ستارہ بنایا ہے

اسلام عظمی

غزلیں

گو آنکھ میں ہے گریہ کی تاثیر ابھی تک
اک بات کوئی دل میں ہے دلگیر ابھی تک

وہ شوخ نگاہی وہ ترے بان نظر کے
پیوست ہے اِس سینے میں وہ تیر ابھی تک

جو لفظ کیے ثبت کبھی تیری جبیں پر
مہتاب میں دِکھتی ہے وہ تحریر ابھی تک

دیکھا تھا تجھے خواب نگر میں کبھی میں نے
رقصاں ہے مرے دل میں وہ تصویر ابھی تک

طوفان ابھی سر سے کہاں گزرا ہے سیّد
لٹکی ہے مرے شہر پہ شمشیر ابھی تک

سید مقبول حسین

میں خاکِ ہست ہوں مشکِ فنا ہوں
خمارِ زندگی کی انتہا ہوں

دیا ہوں روشنی کافی ہے لیکن
ہواؤں کی نظر میں آ چکا ہوں

کہیں یہ بام و در ہی گر نہ جائیں
میں ہر برسات میں یہ سوچتا ہوں

جو خوشبو کی طرح دل میں بسی ہے
میں گویا اس کی ہی بوئے قبا ہوں

گرفتِ زندگی کا کچھ نہ پوچھو
کہ وقتِ ناگہاں سے لڑ رہا ہوں

چھپا ہوں میں ہی اس کے دل میں سیّد
میں خود ہی دل پہ دستک دے رہا ہوں

غزل

قرار آنے لگا ہے، کچھ قرار آنے لگا ہے
مجھے پھر دل پہ اپنے اختیار آنے لگا ہے

یہ میں کیا دیکھتا ہوں خواب آنکھوں میں نہیں ہیں
ترے جانے کا شاید اعتبار آنے لگا ہے

مرے سینے سے سل ہٹنے لگی ہے آرزو کی
کسی کے شیشۂ دل پر غبار آنے لگا ہے

سمجھتا ہے کہ مر جاؤں گا میں اس سے بچھڑ کر
مری باتوں میں وہ بے اعتبار آنے لگا ہے

پلانا تھا مجھے یہ جام تو پہلے پلاتا
کہ شب آخر ہوئی ہے اور خمار آنے لگا ہے

شاہنواز زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون لکیروں کو تصویروں میں ڈھالے
کس کا لہو یہ خاکے، یہ نیرنگ بھرے

غزل

دل میں کیا درد چٹکنے کی صدا آئی مجھے
دیر تک اپنے مہکنے کی صدا آئی مجھے

دھوپ کی ترچھی کرن میں تھا پرندہ کوئی
یا کہیں اس کے جھلکنے کی صدا آئی مجھے

رت جگے آنکھ کی دہلیز پہ آ بیٹھے تھے
پھر کسی خواب کے تھکنے کی صدا آئی مجھے

کہیں تاریخ نے پھر اپنا ورق پلٹا ہے!
یا پلک اپنی جھپکنے کی صدا آئی مجھے

صحن میں سرخ گلابوں کی مہک کیا پھیلی
دیئے پلکوں پہ بھڑکنے کی صدا آئی مجھے

قرمزی شام کی کھڑکی سے اُدھر کچھ بھی نہ تھا
بس ہواؤں کے بھٹکنے کی صدا آئی مجھے

میں کہ خاموش اندھیروں میں مگن تھا حامدؔ
ایسے میں اُس کے چمکنے کی صدا آئی مجھے

حامد یزدانی

غزل

زندگی بھر رہی اُدھوری بات
اُس سے کہنی تھی جو ضروری بات

سن کے آدھی خفا ہوا ہے بہت
کون بتلائے اُس کو پوری بات

کہتے کہتے جو کوئی رُک جائے
لطف دیتی ہے وہ اُدھوری بات

اب تو بس خامشی ہی بہتر ہے
اب بڑھا دے گی اور دُوری بات

کہہ دوں یا پھر چھپائے رکھوں اِسے
دل پہ لکھی ہے اِک سیندوری بات

اِک شعوری سی بات کہہ دی ہے
اور چھپا لی ہے لاشعوری بات

حمیرا راحت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

غزل

زخموں کے ساتھ ڈوب گیا جھیل میں بدن
اب قیدِ جاں سے ہو گا رہا جھیل میں بدن

یوں دھوپ کے عذاب نے گھیراؤ کر لیا
مُرغابیوں کا جلنے لگا جھیل میں بدن

پانی کی آس کر گئی پرواز جاں کے ساتھ
بے روح تشنگی سے ہوا جھیل میں بدن

اہلِ نظر کی گرم نگاہی کا ہے اثر
سہلا رہا ہے چاند مرا جھیل میں بدن

ہو ہو کے خاک اُڑتی رہی ہے کنول کی روح
سیراب گرچہ ہوتا رہا جھیل میں بدن

کیسے میں اپنی ذات کے اجزا بہم کروں
صحرا میں روح آبلہ پا، جھیل میں بدن

انگڑائی لے کے جاگ اُٹھے جس طرح ضمیر
یوں چاند کا لرزنے لگا جھیل میں بدن

منڈلا رہی ہیں یاد کی مُرغابیاں جلالؔ
پھر آنسوؤں کا ڈھلنے لگا جھیل میں بدن

سید قاسم جلال

غزلیں

وہ جو رہتا ہے مرے دیدۂ تر میں اکثر
میں نے دیکھا ہے اُسے شیشے کے گھر میں اکثر

اہلِ دنیا نے کوئی قدر نہ جانی اُن کی
وہ جو رکھتے تھے ہنر، دستِ ہنر میں اکثر

ہم کو دیوار کے سائے سے نہیں ہے نسبت
ہم جنوں پیشہ تو رہتے ہیں سفر میں اکثر

اب گراں، دل پہ گزرتا ہے بہاروں کا خیال
پھول، ہوتے تھے کبھی اپنی نظر میں اکثر

میں کہ ہوں، لذتِ آزارِ محبت کا حریص
لطف ملتا ہے مجھے سوزِ جگر میں اکثر

صرف خوبانِ جہاں ہی نہیں، اہلِ زر بھی
ایک سودائے رعونت رکھیں سر میں اکثر

بھول جائے نہ دھڑکنا، دلِ زندہ، شوکتؔ
عمر گزری ہے اسی خوف میں، ڈر میں اکثر

شوکت محمود شوکت

جرمِ وفا کا دل پہ ہے الزام آج بھی
لیتا ہے خلوتوں میں ترا نام آج بھی

سورج غروب ہوتے ہی گھیریں اداسیاں
آتا ہے یاد کوئی سرِ شام آج بھی

بازارِ مصر، آج بھی سجتا ہے مستقل
بِکتا ہے کوئی یوسفِ بے دام آج بھی

جز عشق، کل بھی کام نہ آتا تھا کوئی اور
جز عشق، آئے کوئی نہ کچھ کام آج بھی

اہلِ ہوس پہ بند ہے یکسر رہِ وفا
راہِ وفا نہیں ہے رہِ عام آج بھی

دشتِ جنوں تو عشق کا انجام کل بھی تھا
دشتِ جنوں ہے عشق کا انجام آج بھی

شوکتؔ، نگاہِ مست سے ہوتی ہے مے کشید
ہے مہربان، ساقیِ گلفام آج بھی

غزل

میں ایک بار نہیں کتنی بار مارا گیا
جہاں بھی وقت پڑا پھر مجھے پکارا گیا

گزشتگاں سے محبت مجھے بتاتی ہے
میں ایک اور زمانے میں بھی اتارا گیا

پڑا ہوا ہوں زمانوں سے اس لیے ویران
میں ایک راستہ جنگل میں سے گزارا گیا

مجھے سمجھیے جواری کے ہاتھ کا سکہ
میں جیتنے کے لیے بار بار ہارا گیا

بچی ہوئی ہے یہ دنیا مرے وسیلے سے
میں ایک شخص جو سب کے سروں پہ وارا گیا

قمر رضا شہزاد

غزلیں

غنچہ کلی گلاب تجھے دیکھتے رہے
اے رشکِ ماہتاب تجھے دیکھتے رہے

جلتا رہا نقاب تجلی کی آگ سے
اور لوگ بے حجاب تجھے دیکھتے رہے

پھر یوں ہوا کہ عزت دستار بھی گئی
خانہ ہوا خراب تجھے دیکھتے رہے

تُو روبرو تھا ایسے کہ آنکھیں جھپک جھپک
میں اور مری کتاب تجھے دیکھتے رہے

آنکھوں کی پتلیوں پہ ترا عکس جب رکا
حیرت زدہ سے خواب تجھے دیکھتے رہے

افتخار شاہد

نارسائی مجھے پسند نہیں
یہ خدائی مجھے پسند نہیں
خامشی چیخ بن گئی ورنہ
لب کشائی مجھے پسند نہیں
اتنے لوگوں کی بھیڑ میں تیری
رونمائی مجھے پسند نہیں
بے طلب ہی نواز دے مجھ کو
یہ گدائی مجھے پسند نہیں
بادشاہا تُو خوش رہے لیکن
جُبہ سائی مجھے پسند نہیں

کورے کاغذ پہ لکھ دیا اس نے
بے وفائی "مجھے" پسند نہیں
سر پہ یادوں کی شال رہنے دو
بے ردائی مجھے پسند نہیں
اب قفس میں سکون ہے شاہد
اب رہائی مجھے پسند نہیں

غزل

ریاض رومانی

چاند کا عکس تھا یا چاند تھا خود پانی میں
مبتلا ہوں میں ابھی تک اِسی حیرانی میں

کچھ ستارے مری پلکوں پہ رُکے تھے آکر
میں اُنھیں اشک سمجھتا رہا نادانی میں

کون رویا تھا مری یاد میں دریا کے اُدھر
پھول بہتے ہوئے آئے ہیں اِدھر پانی میں

ایک درویش کہ حیرت سے سرِ راہ کھڑا
جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا مری پیشانی میں

کِس سے مل آئے ہیں اور ملنا ہے جا کر کِس سے
یاد کچھ بھی نہیں رہتا ہے پریشانی میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے دستِ دعا! دیکھ محبت کا وسیلہ
اے صدق! محبت بھی وصی اور ولی تھی

غزل

اپنی ضرورتوں سے پریشان بھی نہیں
کہنے کو زندگی مری آسان بھی نہیں

دیوانہ بن کے شہر میں کیوں گھومتا رہوں
ایسا ابھی میں چاک گریبان بھی نہیں

دکھ سکھ میں سب شریک تھے اک وہ بھی دور تھا
کب صحن وہ رہے ہیں، وہ دالان بھی نہیں

جیسا تھا اُس کا ظرف، وہ اُس نے دکھا دیا
میں اُس کی بے وفائی پہ حیران بھی نہیں

کیوں کر میں تیرے دستِ حنائی کو تھام لوں
جب تجھ کو میرے قرب کا ارمان بھی نہیں

کچھ سوچ کر ہی راہِ محبت میں رکھ قدم
مشکل نہیں ہے گر تو یہ آسان بھی نہیں

حق سچ کے تیرے ہاتھ میں پتوار ہوں اگر
لے چل سفینہ، راہ میں طوفان بھی نہیں

اس جلوتِ حیات میں روشن ہے آفتابؔ
ورنہ چراغ شام کی پہچان بھی نہیں

آفتاب خان

غزل

احساس بڑھ چلا ہے بہت اب تھکان کا
کب تک اٹھائے بوجھ زمیں آسمان کا

دنیا کی جلتی دھوپ میں ماں کی دعا ہے ساتھ
سایہ ہے سر پہ میرے اُسی سائبان کا

کیوں اجنبی کی طرح یہاں مل رہے ہیں لوگ
میں بھی تو ایک فرد ہوں اس خاندان کا

ہر چیز بک رہی ہے یہاں کوڑیوں کے دام
میں بھی ہوں اشتہار کسی کی دکان کا

پاتال میں پڑا تھا پرندہ مرا ہوا
آنکھوں میں لے کے خواب جو اونچی اڑان کا

بکھرے پڑے تھے جگنو، کہیں تتلیوں کے خواب
منظر عجب تھا شہر میں امن و امان کا

کتنے گھروں کو اُس نے بچایا تھا سنگ سے
ٹوٹا ہے آج آئینہ جس کے مکان کا

جو دوستوں کے روپ میں ملتا رہا ندیمؔ
دل میں گڑا تھا تیر اُسی مہربان کا

ریاض ندیم نیازی

غزلیں

جب دعائے وصل کی تلقین کی
اُس نے ہر اک لفظ پر آمین کی

اس لیے بھی دہریوں سے دور ہوں
دل نہیں سنتا کسی بے دین کی

سرسراہٹ آستینوں میں ہوئی
نبض تھامی تھی ابھی تو بین کی

اِن بیابانوں میں آنا ہے کسے
بے سبب تم نے یونہی تزئین کی

اور تیری دوستی کو کیا کہوں
یار اِس نے زندگی رنگین کی

جانتا ہے وہ خسارہ زیست کا
جس نے بھی ماں باپ کی تدفین کی

کس نے مانگا ہے وفاؤں کا صلہ
کس نے ارشدؔ پیار کی توہین کی

ارشد محمود ارشد

عرق وفا نکال کے ٹھکرا دیا بدن
یہ کس طرح کا عشق تھا گہنا دیا بدن

شب تو خیالِ یار کی چادر میں کٹ گئی
دن بھر غموں کی دھوپ نے جھلسا دیا بدن

اک پنکھڑی گلاب کی ہونٹوں سے آ لگی
یوں ایک لمس نے مرا مہکا دیا بدن

عجلت تھی جانے کونسی اے کوزہ گر تجھے
اک مضطرب سی روح کو پہنا دیا بدن

غیروں سے کیا گلہ کروں اک غمگسار نے
طعنوں کے تیر مار کے زخما دیا بدن

ارشدؔ وہ گرم سانسوں کی حدت کو کیا ہوا
کس نے تمہارا برف میں دفنا دیا بدن

غزل

انصر حسن

کیف و قرارِ قلب کے موسم گذر گئے
یونہی تو جسم و جاں سے نہیں ہم گذر گئے

اپنے قریب آ کے وہ ٹھہرے نہیں کبھی
آنکھیں چرا کے آج بھی ہمدم گذر گئے

تجھ سے مرے حسینؑ پہ گریہ نہ ہو سکا
حالاں کہ اتنے آ کے محرم گذر گئے

ہم تھے علی کے چاہنے والے سو دوستو
ہو کر پلِ صراط سے بے غم گذر گئے

روکا انھیں ضرور عدو نے پہ ماتمی
کرتے ہوئے حسین کا ماتم گذر گئے

دنیا کی دلدلوں سے گذرنا محال تھا
ہم تو اٹھا کے آپ کا پرچم گذر گئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سروں پہ ٹوٹ پڑا کوہسار ابر رواں
ٹھہر سکا نہ مرا قافلہ ترائی میں

غزلیں

ٹھوکروں سے بچائے پھرتے ہیں
آگ خود کو لگائے پھرتے ہیں

پڑ گئی تنگ کیوں زمیں ہم پر
اپنی میّت اُٹھائے پھرتے ہیں

جانے وہ کس گلی سے آ جائے
اپنی نظریں گھمائے پھرتے ہیں

نام تیرا کہیں نہ آ جائے
زخم اپنے چھپائے پھرتے ہیں

درمیاں میں نبیلؔ حوروں کے
کوئی نیکی کمائے پھرتے ہیں

نبیل قیصر

جو بھی کرتا ہے بھول جاتا ہے
روز دریا میں کچھ بہاتا ہے

رائے لوگوں کی اور ہے لیکن
آئینہ اور کچھ بتاتا ہے

پہلے کرتا ہے وعدہ ملنے کا
پھر وہ وعدہ ہی بھول جاتا ہے

اس میں نقصان ہے ترا سائل
کیس وکلا سے کیوں چھپاتا ہے

روز آتا ہے وہ مجھے ملنے
روز رستے سے لوٹ جاتا ہے

کیا قباحت نبیلؔ جھکنے میں
پھل جھکی شاخ پر ہی آتا ہے

غزلیں

بے شجر دور تلک راہ گزر ہو جیسے
زندگی دھوپ کا اک لمبا سفر ہو جیسے

میں نے دیکھا تھا اُسے ڈوبتے سورج کی طرح
مرنے والی کسی خواہش پہ نظر ہو جیسے

دل کی ویرانیوں پہ ایسے گماں ہوتا ہے
دور تک اجڑا ہوا کوئی نگر ہو جیسے

دن بھی ظلمت سے وہاں مانگتا ہے اذنِ طلوع
رات کے تابع وہاں رنگِ سحر ہو جیسے

آ کے ساحل پہ بھی احساس وہی باقی ہے
ہر گھڑی اپنے تعاقب میں بھنور ہو جیسے

احمد جلیل

غم کو عنوان کر لیا میں نے
دل کو ویران کر لیا میں نے

اس محبت کے کھیل میں آخر
دل کا نقصان کر لیا میں نے

اب محبت ہی میرا مسلک ہے
اس کو ایمان کر لیا میں نے

آبلے ، زخم ، درد ، رسوائی
سارا سامان کر لیا میں نے

دسترس سے جو ماورا ہے جلیلؔ
اُس کو ارمان کر لیا میں نے

غزل

ہزار حیف ذرا نم بھی غم نے پایا نہیں
ہزار تر کہ کوئی غم بھی نم نے پایا نہیں

بس اِس قدر ہے کہ اِک نام دلفریب سا ہے
اُمید و ضد میں کوئی فرق ہم نے پایا نہیں

ملا ہمیں دمِ آخر تو یہ سخن چھوڑا
نشانِ جاں تو کوئی دم بھی دم نے پایا نہیں

تھا گنجِ عزلتِ محفل میں تیری قابلِ کشف
ترا زیاں مجھے تیرے کرم نے پایا نہیں

بہت ہوئے تہ و بالائے سطحِ آبِ سحر
کوئی سُراغ بھی اِس زیر و بم نے پایا نہیں

حسنین سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

غزل

شکم کی حسرتیں باقی پڑی ہیں
دہن کی لذتیں باقی پڑی ہیں

ٹھکانہ آخری کب ہے یہ میرا
ابھی کچھ ہجرتیں باقی پڑی ہیں

ترے آنے پہ ٹھہرے گا یہ دل بھی
ابھی کچھ دھڑکنیں باقی پڑی ہیں

ترے ماتھے کی سلوٹ کہہ رہی ہے
ابھی کچھ نفرتیں باقی پڑی ہیں

منادی حُسن کے دیدار کی کر
یہاں کچھ حسرتیں باقی پڑی ہیں

جسے آنا ہے آئے در کھلا ہے
دلوں میں وسعتیں باقی پڑی ہیں

ابھی رکھا ہے دُھندلا آئنوں کو
ابھی کچھ رِنجشیں باقی پڑی ہیں

اگرچہ سامنے ہے میری منزل
مگر کچھ فرقتیں باقی پڑی ہیں

نئے میں آستانے ڈھونڈتا ہوں
ابھی کچھ منتیں باقی پڑی ہیں

میں حاضر ہوں تمھیں روکا نہیں ہے
اگر کچھ تہمتیں باقی پڑی ہیں

گریباں چاک بھی کر لیں گے اپنا
ابھی کچھ وحشتیں باقی پڑی ہیں

منا کر دیکھ لو شہزاد اُس کو
اگر کچھ اُلفتیں باقی پڑی ہیں

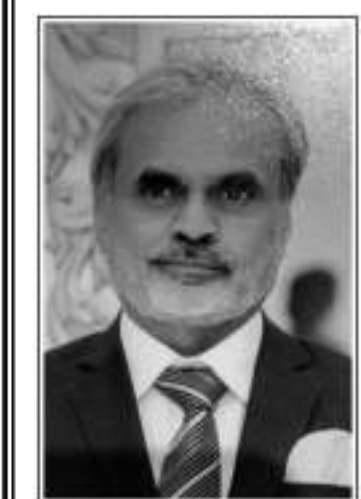

شہزاد احمد شیخ

غزل

نئی زمین نیا آسماں بناتے ہوئے
اُجڑ گیا ہوں میں اپنا جہاں بناتے ہوئے

میں چل رہا ہوں اکیلا کئی زمانوں سے
بھٹک نہ جاؤں کہیں کارواں بناتے ہوئے

الٰہی بھیج دے عرشِ بریں سے لوگ مرے
میں تھک گیا ہوں زمیں پر مکاں بناتے ہوئے

بنا رہا تھا میں کاغذ پہ پیار کا منظر
گلاب راکھ ہوئے تتلیاں بناتے ہوئے

گھرا ہوا ہوں ابھی تک میں آگ میں اس کی
کسی کے حسنِ نظر کو دھواں بناتے ہوئے

یہ معجزہ بھی مرے آنسوؤں کا لگتا ہے
میں نور نور ہوا کہکشاؤں بناتے ہوئے

گزشتہ آندھی سے سہمے ہوئے پرندے ہیں
کسی کو دیکھا نہیں آشیاں بناتے ہوئے

مرا سفینہ بھنور کی حکیم زد میں تھا
مجھے خبر نہ ہوئی بادباں بناتے ہوئے

حکیم خان حکیم

غزل

یہ ٹوٹا پھوٹا سا کچا مکان رہنے دو
مری زمین ، مرا آسمان رہنے دو

کچھ اپنی بات کرو کیسے زندگی کاٹی؟
ہماری درد بھری داستان رہنے دو

پگھل نہ جائیں کہیں موم کی طرح یہ بدن
ذرا سا فاصلہ تو درمیان رہنے دو

کچھ اور وقت اکٹھے گزار لیتے ہیں
وفا کا ذکر ابھی میری جان! رہنے دو

کہیں کہیں تو اُبھرنے دو رفتگان کے رنگ
کہیں کہیں پہ تو میرا نشان رہنے دو

ظہورؔ رابطے کا آخری وسیلہ ہے
محبتوں بھری اُردو زبان رہنے دو

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

غزل

دھڑکنوں پہ اگر کیا افسوس
ہو گا ماخوذ یا روا افسوس

نسل انسان اور ثقافت سے
اعترافی مکالمہ افسوس

یعنی کشمیر اور برما کا
طائرانہ مطالعہ افسوس

ایک دن جشن میں بدل گیا تھا
احتجاجاً کیا گیا افسوس

مجھے ہونا پڑا طلوع رضا
جب اندھیرے نے کھا لیا افسوس

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزل

کنارِ دشت جو یہ جھیل ہے مرے ہمراز
تصورات کی تشکیل ہے مرے ہمراز

ہے بارگاہِ محبت میں حاضری ہر وقت
نہ کوئی وقفہ نہ تعطیل ہے مرے ہمراز

تڑپ اٹھے جو بیک وقت اجنبی دو دل
یہ کیفیات کی ترسیل ہے مرے ہمراز

نہ این و آں کی روش اور نہ پیش و پس کا جواز
ہر ایک حکم کی تعمیل ہے مرے ہمراز

بس اک نگاہِ محبت نے کھولی راہِ سخن
یہ اختصار کی تفصیل ہے مرے ہمراز

جو مسکراؤ تو لو اور تیز ہوتی ہے
کشادہ ماتھے پہ قندیل ہے مرے ہمراز

دنوں کے فاصلے پل میں سمیٹنا چاہوں
مری سرشت میں تعجیل ہے مرے ہمراز

قبول کیسے کرے رحم سے بھرا ہوا دل
جو حقِ ظلم میں تاویل ہے مرے ہمراز

یونہی گماں نہیں گزرا مرے بدلنے کا
نظر کا زاویہ تبدیل ہے مرے ہمراز

ادھورا جسم ہو جیسے نشانۂ تضحیک
تو میری ذات کی تکمیل ہے مرے ہمراز

مرے وجود کا پرتو ہے ہو بہو یہ دشت
یہ باغ آپ کی تمثیل ہے مرے ہمراز

اکرم جاذب

غزلیں

شام سے مستقل دباؤ ہے
کس کی یادوں کا دل پہ گھاؤ ہے

خون اب منجمد نہیں ہو گا
میرے اندر کوئی الاؤ ہے

سب کے چہرے دکھائی دیتے ہیں
آئینوں سے مجھے لگاؤ ہے

ہر طرف ہیں بھنور سمندر میں
پانیوں میں شکستہ ناؤ ہے

زندگی میں سکوں نہیں ملتا
جانے کیوں اس قدر تناؤ ہے

اس کو دیکھوں تو نظم کہتا ہوں
شاعری میں نیا رچاؤ ہے

وہ بلندی سے دیکھتا ہے مجھے
میرا جس کی طرف جھکاؤ ہے

جس کو سمجھا تھا رازداں کی طرح
کیوں بدلتا رہا بیاں کی طرح

نفرتوں کی شکار دنیا میں
کون چاہے گا مجھ کو ماں کی طرح

جانے کس موڑ پر ٹھہر جائے
زندگی مرگ ناگہاں کی طرح

میں درختوں سے مل کے آیا ہوں
دھوپ لگتی ہے سائباں کی طرح

سب ہی دشمن دکھائی دیتے ہیں
کون ہے یار مہرباں کی طرح

ایک پل میں صدی دکھائی دے
ہر کہانی ہے داستاں کی طرح

بے یقینی کہاں سے آئی ہے
کیا یقیں ہو گیا گماں کی طرح؟

منزلوں تک پہنچ ہی جائیں گے
یہ مسافر ہیں ، کارواں کی طرح

محمد نوید مرزا

غزل

رخشندہ نوید

شرمندہ ستم پر وہ ستمگار نہیں تھا
دل اپنا بھی کچھ مائلِ گفتار نہیں تھا

ستم کہ کچھ خاص نہیں وضع میں ہم بھی
تو بھی تو خدا کا کوئی اوتار نہیں تھا

کیوں لوٹ کے آیا نہیں دل جاں چکا ہے
وہ دردِ محبت میں گرفتار نہیں تھا

اک یاد کا احساس رہا آنکھ میں برسوں
اک اشک بھی پلکوں پہ مری بار نہیں تھا

کچھ سنبھلے نہیں تھے ابھی اُس ہار سے ہم بھی
کچھ معرکہ اگلا ابھی تیار نہیں تھا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

اُس کے چہرے پہ یوں چمک آئے
جیسے برسات میں دھنک آئے

دل کی دھڑکن بتا رہی ہے ہمیں
اس کے سینے میں ہم دھڑک آئے

جانے والا تو جا چکا کب کا
اب بھی کمرے سے اک مہک آئے

مجھ کو گھیرا ہوا ہے یادوں نے
جانے اشکوں کی کب کمک آئے

جیسے آتا ہے میہمان کوئی
دل میں ایسے کوئی کسک آئے

فقرِ بوذر کو زادِ راہ کیا
پھر دعائے کمیل تک آئے

کون چھوڑے زمین کو فرخؔ
کون اب جانبِ فلک آئے

سید فرخ رضا ترمذی

غزلیں

اس نے جو عشق وشق کے ہجے الگ نہیں کیے
ہم نے بھی درد سہہ لئے صدمے الگ نہیں کیے

میرے اور اس کے درمیاں رشتہ وبال جان تھا
دل کو سرہانے رکھ دیا، کمرے الگ نہیں کیے

دونوں ہم اک کلاس کے لڑتے تھے زور وشور سے
روٹھنا اور بات تھی بستے الگ نہیں کیے

اس نے کسی کی چاہ میں، چاہ کو میری ڈس لیا
سوچا تو میں نے بارہا رستے الگ نہیں کیے

بیٹوں نے رخ بدل لیا چھوڑ کے اس کو چل دیئے
باپ نے جسم ہار کے رشتے الگ نہیں کیے

ناہید عزمی

اندر سے دل چاٹ رہی جو لہجے کی مغروری تھی
اچھی طرح تم جان گئے ہو، عشق مری مجبوری تھی

چار دنوں میں سات جنم کو جینے والے سنتا جا
سات جنم کا ساتھ ہمارا چار دنوں کی دوری تھی

ہم نے تم سے عشق کیا اور عشق بھی پوری شدت سے
یہ آدھا اظہار ہمارا لفظوں کی معذوری تھی

دل سے اسے لگا لیا ایسا سکوں ملا کہ بس
روتی رہی میں دیر تک کاندھے الگ نہیں کیے

لہجوں کی ساری برہمی سہتی رہی تمام عمر
میں نے کتاب زیست سے بخیئے الگ نہیں کیے

فتنوں نے ایک دوسرے سے کر دیا الگ مگر
لوگوں نے اپنی ذات سے فتنے الگ نہیں کیے

گھر کے ہر اک مقام پر سہمی کھڑی تھیں الفتیں
کمروں سے اس کی یاد کے جالے الگ نہیں کیے

اپنی ہجرت چھوڑ آئی ہوں میں اس کے دروازے پر
اتنی بات بتا کر پلٹی جتنی بات ضروری تھی

بھول آئی ہوں جتنے لمحے اے شبِ ہجراں واپس دے
صول کی خواہش کرنا میری سچ میں اک مجبوری تھی

غزل

لوگ وحشت میں گئے دشت و جبل کی جانب
میں اٹھا اور چلا آیا غزل کی جانب

کیسے پُر کیف مناظر ہیں بنائے اس نے
دیکھیے صنعتِ نقاشِ ازل کی جانب

توڑ لیتی ہے وبا روز کوئی پھول اور ہم
تکتے رہ جاتے ہیں بس دستِ اجل کی جانب

حال و فردا میں بھی ناکام ہی رہتے ہیں وہ لوگ
جو نہیں دیکھتے گزرے ہوئے کل کی جانب

اپنی کٹیا میں وہ آسودگی حاصل ہے مجھے
دھیان جاتا ہی نہیں تاج محل کی جانب

تیری نوخیز جوانی کا خیال آتا ہے
دیکھ کر کھلتے ہوئے ورد و کنول کی جانب

وصل رُت میں بھی کبھی دھیان چلا جاتا ہے
تیری فرقت میں گزارے ہوئے پل کی جانب

منہ دکھائے گا تُو کیا اپنے خدا کو ارشدؔ
اک نظر ڈال ذرا فردِ عمل کی جانب

ارشد شاہینؔ

غزل

پڑا ہوا ہے زمانے میں کال آنکھوں کا
اور اُس نے مجھ سے کیا ہے سوال آنکھوں کا

سجا تو لو گے ہنسی سے تم اپنے ہونٹوں کو
چھپاؤ گے بھلا کیسے ملال آنکھوں کا

شنید ہے کہ وہ ہر بار بچ نکلتا ہے
سواب کے ہم نے بچھایا ہے جال آنکھوں کا

نہ کوئی توڑ مرے حسن کے فسوں کا ہے
نہ کوئی جوڑ تری بے مثال آنکھوں کا

کسی کی آنکھوں میں کیا جانے کیسا جادو تھا
کہ بھولتا ہی نہیں اب خیال آنکھوں کا

بس اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر لی
کسی نے دیکھا نہیں ہے کمال آنکھوں کا

بیان کیسے کروں جو کشش ہے آنکھوں میں
خدا کا حسن ہے حسن و جمال آنکھوں کا

طلسمِ ہوش ربا کا کسی نے ذکر کیا
خیال آیا تیری بے مثال آنکھوں کا

وداع ہوتے ہوئے اس نے اس طرح دیکھا
کبھی بھلا نہ سکوں گی سوال آنکھوں کا

چھلک پڑے ہیں وہیں ساغر و سبو سارے
جہاں بھی آیا ہے مجھ کو خیال آنکھوں کا

جوان کو دیکھتا ہے راہ بھول جاتا ہے
مسافروں سے تو پوچھو کمال آنکھوں کا

اب اس قدر بھی نہ آنسو بہاؤ اے رفعتؔ
یہ کر دیا ہے بھلا کیسا حال آنکھوں کا

رفعت وحید

غزل

وُہ ترے فکر کی نظر میں ہے
بات گھر کی ہے اور گھر میں ہے

کیوں نہ منزل قریب آئے مرے
میرے ہمراہ وُہ سفر میں ہے

تیرے چھونے کی یہ کرامت ہے
تازگی آج تک شجر میں ہے

اُسکی اُونچی اُڑان ہے تاثیرؔ
کیا اثر اُسکے بال و پر میں ہے

نقش ہے جو تمہاری آنکھوں میں
نہ وُہ دیوار میں نہ در میں ہے

دلکشی جو عطا ہوئی تُجھ کو
شام میں ہے نہ وُہ سحر میں ہے

روشنی ہے جو تیرے چہرے پر
شمس میں ہے نہ وُہ قمر میں ہے

جو خزاؤں میں مسکراتا ہے
لگتا ہے وہ تیری نظر میں ہے

تُجھ پہ اُس کا اثر نہیں ہوتا
اشک جو میری چشمِ تر میں ہے

تاثیر نقوی

غزلیں

ملال ہے کہ اب کوئی ملال کیوں نہیں رہا
یہ تو بھی سوچ تو مرا سوال کیوں نہیں رہا

نئی محبتوں میں وہ روایتیں کہاں گئیں
یہ اب تجھے قبیلے کا خیال کیوں نہیں رہا

ہر ایک بات مان لی تو کہہ دیا جناب نے
کوئی تو بات ہے کہ بات ٹال کیوں نہیں رہا

یہ اب کی بار پھول مجھ کو پھول کیوں نہیں لگے
کبھی جو تھا بہار کا جمال کیوں نہیں رہا

نئے تعلقات میں صغیرؔ کے ہی تذکرے
وہ اپنے دل سے اب مجھے نکال کیوں نہیں رہا

صغیر احمد صغیر

جنوں تمام ہو بے رہروی مکمل ہو
مجھے ملو کہ مری زندگی مکمل ہو

اسی لیے ہی مسافت ادھوری چھوڑی ہے
میں چاہتا ہوں ترے ساتھ ہی مکمل ہو

تمام پھول مرے ساتھ انتظار میں ہیں
کہ آپ آئیں مری شاعری مکمل ہو

یہ بات لوگوں پہ اکثر گراں گزرتی ہے
جو آ گئی ہو تو پھر آ گہی مکمل ہو

نجانے کب کوئی مجھ سے مجھے ملائے گا
نجانے کب یہ مری بے دلی مکمل ہو

میں ناگواری کا اظہار تک نہیں کرتا
صغیرؔ پر یوں تری برتری مکمل ہو

غزلیں

لب شگفتہ ہے آنکھ گیلی ہے
زندگی ہنستے روتے جی لی ہے
کون روتا ہے پھوٹ کر مجھ میں
کہ فضا دل کی سیلی سیلی ہے
آرزو چاہتی ہے کلیانا
کیا کیا جائے رُت ہی پیلی ہے
دکھ میں کب کون جھومتا ہے بھلا
درد کی تان ہی سُریلی ہے

یاد کا ذائقہ عجیب سا ہے
کبھی میٹھی کبھی کسیلی ہے
پیاس بجھتی نہیں کسی شے سے
جانے کیا آگ میں نے پی لی ہے
ایسا کیا زہر چڑھ گیا ہے امرؔ
جسم پیلا ہے روح نیلی ہے

امر مہکی

قدم قدم پہ انا کو کُچلنا پڑتا ہے
حصارِ ذات سے جب بھی نکلنا پڑتا ہے

ہمیشہ ساتھ کسی کا ملے ضروری نہیں
کبھی سبھی کے مخالف بھی چلنا پڑتا ہے

کسی کو فکر نہیں کون کیسے حال میں ہے
سو ایسے حال میں خود ہی سنبھلنا پڑتا ہے

کسی کی بات ہنسی میں اُڑانی ہوتی ہے
کسی کی بات پہ لہجہ بدلنا پڑتا ہے

ہر اِک قدم پہ امرؔ وقت دیکھتا ہے کیا
کہ انتظار میں تھوڑا ٹہلنا پڑتا ہے

غزل

کس نے نبھائے ہیں یہاں پیماں نہ پوچھئے
کتنے بدل چکے ہیں اب انساں نہ پوچھئے

اک مور جیسے موج میں ہو ناچتا ہُوا
آنگن میں دل کے کون ہے رقصاں نہ پوچھئے

کاندھوں پہ اک صلیب ہے بس اور کچھ نہیں
ہم سے سفر کے واسطے ساماں نہ پوچھئے

ہم نے لہو کے ساتھ ہی کیا کچھ جلا دیا
ہم سے ہمارے دل کے اب ارماں نہ پوچھئے

مشکل پسند ہو گئے جب مشکلیں پڑیں
ہم سے کوئی سوال بھی آساں نہ پوچھئے

کمہلا گیا ہے پھول کہ خوشبو جدا ہوئی
جبرانؔ کس لیے ہے پریشاں نہ پوچھئے

وسیم جبران

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھول ہیں ، تتلیاں ہیں ، آنچل ہیں
چار سو ، انتشار سا ، کچھ ہے

غزلیں

کچھ روز اگر اور وہ تاخیر سے ملتا
ممکن تھا کہ مجھ سے نہیں تصویر سے ملتا

یہ زخم بہر حال تھا اس دل کا مقدر
طعنے سے نہ ملتا تو کسی تیر سے ملتا

مقبول تو ہوتی نہیں ہر ایک دعا بھی
ہر خواب کا حُلیہ نہیں تعبیر سے ملتا

اک آس پہ ٹھہرا ہوں وگرنہ تھی وہ عجلت
مرنے کا سبب بھی مری تحریر سے ملتا

منزل پہ پہنچتی نہیں یکطرفہ محبت
ہاری کو تو حصہ نہیں جاگیر سے ملتا

یہ اوج جو رسوائی نے بخشا مجھے عزمیؔ
ممکن ہی نہیں تھا کبھی توقیر سے ملتا

عزم الحسنین عزمی

کیا بچتا میں غم کی کھینچا تانی سے
لے گیا جتنا ہاتھ لگا آسانی سے

یہ شہزادہ سازش سے کتراتا ہے
ممکن ہے محروم رہے سلطانی سے

مجھ کو ایک خوشی نے دی آواز ذرا
بھاگ گیا اک درد مری نگرانی سے

سر کا برتن بھر جائے تو ممکن ہے
درد چھلکنے لگ جائے پیشانی سے

صاف کرے کب دانائی کا پانی بھی
داغ جو اکثر لگتے ہیں نادانی سے

میں مسکان کی اک تلوار اٹھا لایا
تگڑا جوڑ پڑا گھر کی ویرانی سے

عشق ہوا تو مجھ پر بھید کھلا عزمیؔ
لفظ کھڑا ہے کوسوں دور معانی سے

غزل

پل میں رنجش بھلا کے بیٹھے ہیں
ہم سے بہتر تو یار بچے ہیں

اتفاقاً ادھر کو آ نکلے
ہم کہیں اور کے پرندے ہیں

جس کو احساس ہے ، وہ اپنا ہے
لوگ تو جانے کتنے ملتے ہیں

جن سے گاؤں میں رونقیں تھیں کبھی
اب کہاں پر وہ لوگ بستے ہیں؟

اب کیوں چھاؤں کو یاد کرتے ہو؟
تم نے بستی کے پیڑ کاٹے ہیں

کس نے بچوں کا بچپنا چھینا؟
وہ مسائل پہ بات کرتے ہیں

زہر دل میں سمیٹ کر بابرؔ
لوگ میٹھے ، بلا کے میٹھے ہیں

احمد سجاد بابر

غزلیں

جاری ہے جب سے نقطۂ تسخیر کا سفر
میں دیکھتا ہوں خواب میں تعبیر کا سفر

خالق کو کوئی چاک گھمانا نہیں پڑا
کن سے ہے کل جہان کی تعمیر کا سفر

ویسے بڑا عجیب ہے آنکھوں کا کینوس
رنگوں سے پھیل جاتا ہے تصویر کا سفر

پتھر کا دور صرف علامت کا دور تھا
لفظوں کی بازگشت ہے تحریر کا سفر

دشمن اچھالتے رہے انکی بھی پگڑیاں
جو خامشی سے کر گئے توقیر کا سفر

منزل ہمیں نہ جانے کہاں لے کے آ گئی
ہم کر رہے ہیں عمر سے تقدیر کا سفر

گھر کر گیا ہے روح کے ریشوں میں درد دل
جب سے کیا ہے ہجر کی تاثیر کا سفر

آنکھیں لہو لہو ہیں یا منظر لہو لہو
پاؤں کے ساتھ ساتھ ہے زنجیر کا سفر

ساجد رضا خان

اب کسی ظلم کا اقرار نہیں ہو سکتا
میں زمانے کا طرفدار نہیں ہو سکتا

میں کہیں بھی نہیں جاتا ہوں مگر سوچتا ہوں
تیرے کوچے سے تو بے زار نہیں ہو سکتا

تم تو خود پر ہی لیے بیٹھے ہو لیکن یہ دل
اب کسی کا بھی طلب گار نہیں ہو سکتا

تم جو چاہو تو مری جان بھی لے سکتے ہو
بات حق کی ہو تو انکار نہیں ہو سکتا

خواب میں بھی اسے چھونے کی اجازت نہ ملے
عشق اس درجہ بھی لاچار نہیں ہو سکتا

عالمگیر ہراج

غزلیں

میں تیر آیا ہوں گو کچے گھڑے تھے
سرِ ساحل پریشاں تم کھڑے تھے

مرے بچپن کے جو دن تھے کڑے تھے
وراثت میں ہی دکھ آئے بڑے تھے

ابھی سے حوصلہ کیوں ہار بیٹھے
ابھی تو کچھ قدم آگے بڑھے تھے

پرائی جنگ کا ایندھن بنے ہیں
کہاں اپنی لڑائی ہم لڑے تھے

حقیقت میں وہی تھے دوست احمدؔ
پریشانی میں جو باہم کھڑے تھے

احمد محسود

اس کی دیتے خبر پرندے ہیں
کہ مرے نامہ بر پرندے ہیں

کل قفس سے انہیں رہائی ملی
زد پہ بارِ دگر پرندے ہیں

جنگ کی آگ ہم نے بھڑکائی
زد میں آئے مگر پرندے ہیں

آشیانوں میں سانپ رہتے ہیں
اس لئے در بہ در پرندے ہیں

تم سا کم ظرف کون دنیا میں
تم سے خائف اگر پرندے ہیں

دیکھ اس عہدِ بدگمان میں بھی
میرے تو دوش پر پرندے ہیں

اب مری گفتگو انہیں سے ہے
اب مرے چارہ گر پرندے ہیں

ان کی بولی تُو سیکھ لے احمدؔ
خوش گلو کس قدر پرندے ہیں

غزلیں

جو نئے وقت کو تجرید نہیں کر سکتا
میرے اشعار کی تردید نہیں کر سکتا

تو ابابیل کی منقار سے واقف ہی نہیں
جو دیے کرتے ہیں خورشید نہیں کر سکتا

میرے نقاد ترا ذوق نظر اپنی جگہ
تو مرے درد پہ تنقید نہیں کر سکتا

وقت نے اور نکھارا ہے مجھے بعد ترے
تو سمجھتا تھا کہ میں عید نہیں کر سکتا

میرے اجداد نے وہ ظلم سہے ہیں کہ رمیضؔ
میں کبھی ظلم کی تائید نہیں کر سکتا

رمیض نقوی

دیکھ کر تجھ کو مشتعِل نہ ہوا
یعنی پتھر ہوا وہ دِل نہ ہوا

کتنے سورج چھپائے پھرتا ہے
باقی جو کچھ ہوا یہ تِل نہ ہوا

آنکھ سے دل میں ہم اتر نہ سکے
ایک منظر جو مستقِل نہ ہوا

آگ پانی سے بجھ گئی یعنی
عشق وحشت پہ مشتمل نہ ہوا

اس کے لہجے میں سرد مہری تھی
ذہن اپنا بھی معتدل نہ ہوا

اس کی 'ہائے' پہ کتنے مرتے ہیں
اپنا مرنا بھی جاں گسِل نہ ہوا

جسم فانی ، رمیضؔ لافانی
اس لیے شعر مبتذِل نہ ہوا

غزل

واہمہ بن گیا خیال کہ تو
میں ہوں اس بات پر نہال کہ تو

زندگی مل رہی تھی لوگوں کو
میرے لب پر یہی سوال کہ تو

ہم کہ تنہا ہی لوٹ آئے تھے
دل کو لیکن رہا ملال کہ تو

ہجر کے لازوال لمحوں میں
ایک ہی مدعا وصال کہ تو

دشت کی بیکراں مسافت میں
سوچنا بھی ہوا محال کہ تو

سانس ہوتی ہے جب بحال کہیں
بولتا ہے ترا کمال کہ تو

صرف نسبت ہے معتبر عاصمؔ
ورنہ تیری کہاں مجال کہ تو

عاصم اعجاز

غزلیں

اسی لیے تو اجالوں سے دوستی ہوئی ہے
کہ تیرے آنکھ جھپکنے سے روشنی ہوئی ہے
ضرور عشق کی حدت سے یہ نمی ہوئی ہے
کہ گھاس آپ کے چلنے سے ریشمی ہوئی ہے
ہمیں یقین ہے اس باغ کے نہیں ہو تم
کہ ہم نے چڑیوں کی تعداد تک گنی ہوئی ہے
اسی کا حق ہے کہ دیوان اس کا نام کروں
وہ جس کی یاد میں دن رات شاعری ہوئی ہے
میں ایک نقطے پہ مرکوز ہو گیا ہوں، تبھی
زمین گھوم رہی تھی، پر اب تھمی ہوئی ہے

عدنان خالد

گر تری جنبش ابرو کا اشارہ ہو جائے
ڈوبتے شخص کو تنکے کا سہارا ہو جائے
ہم سے بدبخت کے حق میں کوئی تارا ہو جائے
عین ممکن ہے کسی دن وہ ہمارا ہو جائے
خواب میں آ کہ ہو نیندوں پہ بھروسہ بھی کوئی
یار ملنے کا بس اک ایسے ہی چارہ ہو جائے
اس سے پہلے کہ تجھے دل سے بھلا دیں ہم بھی
اور پھر تیری جگہ کوئی ہمارا ہو جائے
وہ جو حاصل نہ ہوا خیر کوئی بات نہیں
وہ کسی اور کا ہو کیسے گوارا ہو جائے

یہ لوگ یونہی غذاؤں کو دوش دیتے ہیں
ہمارے خوں میں محبت کی بس کمی ہوئی ہے
تمھاری آنکھ کا کاجل بکھر گیا ہے کہیں
تبھی تو شام اچانک سے سرمئی ہوئی ہے
سمجھ چکا ہوں میں لہجے کی سلوٹیں عدنان
سو جانتا ہوں ملاقات آخری ہوئی ہے

زندگی نیند سے اٹھ جائے اگر جانِ جہاں
اس کے ہونٹوں پہ بس اک بوسہ تمھارا ہو جائے
ہونے آئے تو بھلا کیا نہیں ہوتا ہے یہاں
چاند بھی عشق کرے اور ستارہ ہو جائے
ڈھونڈنے والے پریشان بہت ہیں عدنان
کیا یہ ممکن ہے کوئی ویسا خدارا ہو جائے

غزلیں

وہ میرے خواب سنوارے کہ پائمال کرے
سلوک جو بھی کرے میرے حسب حال کرے

گزشتہ چاہتوں کا اتنا تو خیال کرے
"اسے کہو کہ تعلق کو پھر بحال کرے"

اگر ہے حوصلہ اس میں تو چھوڑ جائے مجھے
مرے تو بس میں نہیں وہ ہی یہ کمال کرے

مرے جواب سے اسکو کہیں ملال نہ ہو
اسے کہو کہ نہ مجھ سے کوئی سوال کرے

لکھوں میں جو بھی لکھوں اس کے ہی حوالے سے
وہ پڑھ کے شعر مرے ان کو لازوال کرے

ہمارے درد کا درماں کسی کے پاس نہیں
اثر نہ اس پہ کوئی حرف اندمال کرے

نائلہ راٹھور

تو کہ رسوائی کی زد پر ہی زمانے رکھے
راز میرے تو فقط میرے خدا نے رکھے

وہ بھی دن بھر کا تھکا ہارا مجھے بھول گیا
سو گئی میں بھی کئی خواب سرہانے رکھے

جانتی میں بھی ہوں آسان نہیں ہے اتنا
یہ کرم ہے کہ مجھے ملنے کی ٹھانے رکھے

دیکھتا ہے تو میں مائل بہ غزل ہوتی ہوں
جس کی ہر بات میں الفت کے فسانے رکھے

میری حق گوئی شکستوں پہ شکستیں کھائے
سامنے میرے اگر اپنے بہانے رکھے

نئے رستوں پہ نکل آئی ہوں میں بھی دیکھو
اپنی آنکھوں میں وہی خواب پرانے رکھے

عنبرین خان

غزلیں

یوں تو سب نے چھوڑ ہی جانا ہے دنیائے فانی کو
لیکن یاد رکھے گی دنیا میری نقل مکانی کو

میں تو قدرت کے شہکار کو دیکھ کے ہوں حیران کھڑا
تم حیرت سے دیکھ رہے ہو کیوں میری حیرانی کو

روتی رہتی ہیں یہ آنکھیں انسانوں کی وحشت پر
کڑھتا رہتا ہے دل دیکھ کے خون کی اِس ارزانی کو

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سارے ہی بدن کی قید میں ہیں
کون رہائی دے گا آ کے مجھ ازلی زندانی کو

تیری کیا منشاء ہے کچھ تو بول مرے معبود ذرا
صرف جھکاؤں سر کو اپنے یا رگڑوں پیشانی کو

یوں پی جاتی ہیں یہ آنکھیں میرے آنسو اب تاثیر
جیسے کوئی پیاسا صحرا پی جاتا ہے پانی کو

تاثیر جعفری

مری کہانی کے کردار مر گئے سارے
سنا ہے آج قلم کار مر گئے سارے

رہیں ہیں جاگتی بازارِ حسن میں راتیں
ہوئی جو صبح تو بازار مر گئے سارے

لٹی غریب کی بیٹی تو سرخیاں بھی لگیں
وزیر زادی تھی، اخبار مر گئے سارے

ہُوا تھا قتل گلستاں میں تتلیوں کا رات
اُسی کے سوگ میں گلزار مر گئے سارے

چلو کہ کوچ کریں شہرِ اجنبی سے اب
یہاں ہمارے طرف دار مر گئے سارے

وجود چاٹ رہی ہے ہمارا، دھوپ کڑی
سڑک کنارے تھے اشجار مر گئے سارے

ہمیں تلاش ہے سقراط کی نئی یاسینؔ
ہمارے اپنے تو افکار مر گئے سارے

ایم یٰسین آرزو

غزلیں

عمار یاسر مگسی

درخت کاٹ رہے ہیں مگر لگاتے نہیں
یہ لوگ خود کو جہنم سے کیوں بچاتے نہیں

میں دکھ سناتا نہیں ہوں کبھی درختوں کو
مرے دکھوں پہ یہ روتے ہیں مسکراتے نہیں

وہ جس شجر کا نہ سایہ ہو اور نہ پھل، اس پر
پرندے بیٹھ تو جاتے ہیں چہچہاتے نہیں

خدا، درخت، ستارے بھی رفتگاں کی طرح
بس اپنے پاس بلاتے ہیں، پاس آتے نہیں

طارق جاوید

زندگی تیرے اک اشارے پر
آ گیا وقت کے میں دھارے پر

چھوڑ کر جا رہا ہے کیوں پھر تو
مر نہ جاؤں میں اس خسارے پر

زندگی آج بھی تڑپتی ہے
موت کے آخری کنارے پر

میرا انجام بھی ہے مٹی ہی
میری بنیاد بھی ہے گارے پر

اس کی جانب چلا تو جاؤں میں
وہ مجھے نام سے پکارے پر

غزلیں

تبھی دامن ہمیں اپنا چھڑانا پڑ گیا تھا
ہمارے درمیاں شاید زمانہ پڑ گیا تھا

مری آواز بھی تب کھو گئی تھی دل میں میرے
وہ میرے سامنے تھا اور بلانا پڑ گیا تھا

وہ دنیا دار تھا پر بے وفا ہرگز نہیں تھا
تعلق اس لیے اس سے نبھانا پڑ گیا تھا

اسے کیا نام لے کر وقتِ رخصت روکتا میں
دیا یہ سوچ کر مجھ کو بجھانا پڑ گیا تھا

اچانک منتظر جب حال اس نے پوچھا میرا
مجھے روتے ہوئے بھی مسکرانا پڑ گیا تھا

ملک منتظر ہانس

پھول چہرے پر وہ اشکوں کو مسلتی ہی رہی
آگ آہوں کی مگر من میں بھڑکتی ہی رہی

اک تبسم اس کی رعنائی سے کچھ کہتا رہا
چیخ اک سینے میں دب کر پھر مچلتی ہی رہی

اس کی باتوں میں نشہ تھا سن کے سب حیران تھے
دیر تک بادِ صبا گلشن میں چلتی ہی رہی

عشق کے آزار یارو کس قدر سنگین تھے
جان پر ہر لمحہ آفت کوئی بنتی ہی رہی

یہ انا قاتل ہے میری بات کو تم مان لو
یہ بلا معصوم جانوں کو نگلتی ہی رہی

خامشی سے بہہ رہا ہے جس طرح آبِ رواں
زندگی اپنی شہاب ایسے گزرتی ہی رہی

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

ایسا نہیں کہ تم سے محبت نہیں رہی
سچ ہے مگر وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی

اب اس قدر بھی پیار سے ہم کو نہ دیکھیے
اس درجہ التفات کی عادت نہیں رہی

میں عمر بھر خلوص و وفا بانٹتی رہی
میرے نصیب میں ہی یہ دولت نہیں رہی

گرچہ خلوص کا کبھی پایا نہیں صلہ
پھر بھی کبھی کسی سے عداوت نہیں رہی

روبی ملی حیات کی ہر اک خوشی، مگر
اس وقت جب حیات کی حاجت نہیں رہی

روبینہ ممتاز روبی

جب چلے سب مرے اشاروں پر
ڈال دوں گی کمند تاروں پر

تیری قدرت کا ہی کرشمہ ہے
چاند حاوی ہے سب ستاروں پر

غم جو حد سے گزر گیا تو پھر
ہوں گے روشن دیے مزاروں پر

پتھروں پر بھی پھول کھل تو گئے
بوجھ کتنا پڑا بہاروں پر

تیرے سہرے کو دم کیا ہے اور
میں نے موتی جڑے ہیں ہاروں پر

ان ہواؤں کا کیا کروں آیتؔ
تجھ کو لکھتی ہیں آبشاروں پر

آیت آفرین

غزلیں

محمد حماد

وصل و ہجراں کی کہانی اور ہے
یعنی رنجِ رائیگانی اور ہے

جان لو ہم ہیں تمہارے خیر خواہ
ہم نے تم کو رہ دکھانی اور ہے

اور ہی لب پر ہے جاری داستاں
آنکھ سے ٹپکی کہانی اور ہے

یہ ترے ماتھے کی شکنیں اور ہیں
یہ مری آنکھوں کا پانی اور ہے

لالہ و گل کی بھی اپنی بات ہے
پر تری دلکش جوانی اور ہے

عام پھولوں میں نہ رکھ اس پھول کو
یہ محبت کی نشانی اور ہے

عشق میں جیتے ہیں مرنے کے لئے
کیا حیاتِ جاودانی اور ہے؟

اسد رضا سحر

شامل کسی ادھوری کہانی میں ہو گئے
دن زندگی کے پورے جوانی میں ہو گئے

آنکھوں سے ایک عرصہ بہایا گیا جسے
کچھ مسئلے تو حل اُسی پانی میں ہو گئے

تھوڑی سی دیر آنکھ نے جھیلا تمہارا ہجر
قطرے لہو کے جاری روانی میں ہو گئے

انگلی میں جیسے آئی انگوٹھی تو یوں لگا
کچھ خواب میرے پورے نشانی میں ہو گئے

آئے ہوئے تھے جو بھی گلابوں کے واسطے
وہ لوگ محو رات کی رانی میں ہو گئے

تحریر کچھ ہوئی ہیں دلوں پر عبارتیں
کچھ قول اُس کے میرے زبانی میں ہو گئے

غزل

میں اپنا حال اُس سے کیا کہوں گا
زیادہ سے زیادہ رو پڑوں گا

جب اپنے خال و خد کی یاد آئی
تری تصویر پھر سے دیکھ لوں گا

سنبھالے گی مجھے خود آشنائی
اگر میں اپنے پیروں پر گروں گا

کہوں گا کیوں بھلا کچھ بھی کسی سے
مگر آئینے سے میں سب کہوں گا

اگر بھولا کبھی میں شکل اپنی
تو اپنے آپ کو پہچان لوں گا

عبث الزام ہے غفلت کا مجھ پر
خدا معلوم کس دنیا میں ہوں گا

کنور امتیاز احمد

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

قصہ مختصر وہ نہ صرف ہمارا وظیفہ بحال کر گیا بلکہ کتابوں کے لئے پانچ سو ڈالر فی کس مزید دے گیا۔

اگر اس وقت یونیورسٹی میں الیکشن ہوتے تو کم از کم سب مسلمانوں کے ووٹ مجھے ملتے۔ پاکستانی، ہندوستانی، انڈونیشیا اور ملائی مسلمانوں نے مل کر باقاعدہ مسجد بنا ڈالی تھی۔ جہاں سے مؤذن پانچ وقتی اذان دیتا۔ لڑکوں کی اکثریت باقاعدگی سے نماز پڑھتی۔ کھانے کے لئے انہوں نے مسلم کاؤنٹر بھی الگ بنایا ہوا تھا جہاں پر حلال گوشت ملتا۔ باورچی بھی تھائی مسلم تھے۔ اس کے علاوہ بھی ہر مذہب کے کاؤنٹر تھے۔

ایک مرتبہ میں نے تھائی کاؤنٹر سے بھنے ہوئے مرغ کی ٹانگ اُٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لی۔ ایک پاکستانی لڑکا ساتھ کھڑا تھا۔ بولا ''شاہ صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ آلِ رسول ہو کر کافروں کا کھانا کھا رہے ہیں۔''

''I am sorry'' کہہ کر میں نے وہ پیس واپس رکھ دیا۔

ہر اتوار کو تبلیغی جماعت کے لڑکے میرے کمرے میں آجاتے اور اصرار کرتے کہ میں ان کے ساتھ دیہات میں اسلام کی تبلیغ کے لئے چلوں۔ زبان کا مسئلہ حل کرنے کے لئے وہ تھائی مسلمانوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے۔ کافی پاکستانی تھے جو MSC اور پی ایچ ڈی کرنے کے لئے آئے تھے۔

میرا روزمرہ کا معمول تھا کہ صبح اُٹھ کر سیر کے لئے نکل جاتا۔ ہوٹل کے ساتھ ہی گالف کورس تھا۔ دبیز گھاس پر چلنے میں بڑا مزا آتا۔ چارسو رنگ برنگے پھولوں سے اُٹھتی ہوئی خوشبو اس لطف کو دوبالا کر دیتی۔ واپسی پر تیار ہو کر ہوٹل ریسٹورنٹ میں ناشتہ کرتا۔ یہاں ٹیبل سروس تھی اور میس کی نسبت کھانا خاصا مہنگا تھا۔ صبح 8 بجے سے لے کر شام 4 بجے تک کلاسیں ہوتیں۔ ایک بجے لنچ کا وقفہ ہوتا۔ وقت کی پابندی کا بڑا خیال رکھا جاتا۔ کبھی کوئی لیکچرر پانچ منٹ کی تاخیر سے نہ آتا۔ یہی حال ہم لوگوں کا تھا۔ لالے تو نصف گھنٹہ پہلے آ کر اپنی سیٹوں پر براجمان ہو جاتے۔ ہفتے میں دو دن چھٹیاں ہوتیں۔ اکثریت بنکاک نہ جا پاتی۔ بنکاک جانے کا لطف تو جب ہے کہ جیب میں پیسے ہوں۔ ساری رقم تو سرشتے کے ذریعے یونیورسٹی کے Coffers میں چلی جاتی۔ لڑکے طنزاً کہتے یہ رقم کافرز میں نہیں گئی کافروں کی نذر ہو گئی ہے۔

یونیورسٹی سے بنکاک تک کوئی ریگولر بس سروس نہ تھی۔ بسیں رنگ ست کے قصبے سے چلتیں جو پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے لئے لت (رکشہ) لینا پڑتا۔ یونیورسٹی بس صرف ویک اینڈز پر چلتی۔ اس کے لئے بھی پہلے سے ریزرویشن کرانا پڑتی۔ میں ایک ماہ تک بنکاک نہ گیا۔ دل ہی نہیں کرتا تھا۔ درس گاہ کا ماحول ہی بڑا کیف آور تھا۔ چونکہ ایک نیا مضمون پڑھ رہے تھے اس لئے خاصی محنت کرنا پڑتی۔ ان دنوں منی کمپیوٹر مارکیٹ میں نہ آئے تھے۔ ایک بڑے ہال میں کمپیوٹر مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ساری ساری رات ان پر بیٹھے کام کرتے۔ میں بھی حسبِ توفیق ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا۔ کن ہان نے اس مضمون پر جتنی کتابیں تجویز کی تھیں میں نے ساری پڑھ ڈالیں۔ ویسے بھی انسٹی ٹیوٹ میں ہر روز کوئی نہ کوئی پروفیسر آیا رہتا۔ دنیا کے نامور آدمیوں کے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقعہ ملتا تھا۔ لیکچرز ہوٹل کے

آڈیٹوریم میں ہوتے۔ ایک طویل عرصہ سے انگریزی فلمیں دیکھنی چھوڑ دی تھیں۔ یہاں آ کر وہ شوق پھر سے جوان ہو گیا۔ ورس گاہ کے باہر دھان کے کھیتوں کا لمبا سلسلہ تھا۔ شام کو چہل قدمی کرتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ عادتیں تو نہیں بدلتیں لیکن وقتی طور پر ہی سہی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

جوش کی جولانیاں: وہ تو خدا بھلا کرے اُستاد جوش کا جنہوں نے بنکاک سے نہ صرف خود شناسائی پیدا کی بلکہ ہمیں بھی ٹھیک طرح سے متعارف کرایا۔ بظاہر تو مجھے ملنے آئے لیکن اے آئی ٹی کے ڈل ماحول سے دوسرے دن ہی اُکتا گئے۔ کہنے لگے ''میری وجہ سے تمہاری پڑھائی میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کلاں فیل ہو کر مجھے مورد الزام ٹھہراتے رہو اس لئے میں نے بنکاک جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

عرض کیا ''اس نیک کام کا تو پاکستان میں خیال کر لینا چاہئے تھا۔''

بولے ''نیکی کا خیال جس وقت بھی آ جائے کارِ ثواب ہے۔''

''بنکاک بہت بڑا شہر ہے۔ آپ ٹھہرے اجنبی۔ کہیں کھو نہ جائیں۔''

ہنس کر فرمایا ''اس شہر میں کوئی اجنبی نہیں ہوتا۔ ایئرپورٹ سے نکلتے ہی اجنبیت کی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔''

تیسرے دن استاد کا فون آ گیا۔ کہنے لگے جلد پہنچو، میں تمہیں ایک دلچسپ خالصے سے ملوانا چاہتا ہوں۔

''سردار تو سبھی دلچسپ ہوتے ہیں اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟''

ارے نہیں! یہ خالصوں کا بھی خالصہ ہے۔ سرداروں کا بھی سردار ہے بلکہ ایک اچھوتا کردار ہے۔ لگتا ہے ڈی ایچ لارنس، منٹو اور پنڈت کو کانے مل کر اسے تخلیق کیا ہے۔

مہاراجہ امرجیت سنگھ: کیا آپ نے ایسا مہاراجہ دیکھا ہے جس کی کوئی پرجا نہ ہو؟ ایسے شہنشاہ سے ملے ہیں جو بغیر کسی اقلیم کے ہو؟ ایسا جرنیل نظر آیا ہے جس کی کوئی فوج نہ ہو۔ شاید آپ سمجھیں کہ اگلے وقتوں کی کوئی بھارت ہے یا پھر عصر حاضر کا لطیفہ بیان کیا جا رہا ہے۔ نہ تو یہ بھارت ہے نہ کسی لطیفے کی شرارت اور فرض کیجیے کہ ہے بھی تو پھر اس لطیفے نے مجسم شکل اختیار کر رکھی ہے۔ بنکاک میں بڑی مشہور جگہ ہے سیام اسکوئیر۔ وہاں سیام انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل ہے۔ ہوٹل کے بالمقابل ایک چھوٹی سی گلی سوئے پانچ (SOI-5) ہے۔ اس گلی کی نکڑ پر ایک چھوٹی سی درزی کی دکان ''مہاراجہ ٹیلرنگ'' ہے۔ اس دکان کے مختصر کیبن میں مناسب قد کاٹھ کا سکھ بیٹھا نظر آئے گا جس کی داڑھی، پگڑی کیس، کڑا اور کچھ ایک روایتی سکھ ہی کی طرح ہیں۔ کرپان شاید اس لئے نہیں رکھتا کہ اس کی زبان ہی تلوار کا کام کر جاتی ہے لیکن یہ ایک عام سکھ نہیں

ہے۔ مہاراجہ امرجیت سنگھ بہادر، آنریری سکس سٹار جنرل آف دی یو ایس آرمی، فیوچر کنگ آف دی خالصتان کنگڈم۔ حال پروپرائٹر مہاراجہ ٹیلرنگ شاپ ہیں۔ ہندوستان میں انہیں کوئی جانتا یا نہ جانتا ہو، تھائی لینڈ میں پہچانتا یا نہ پہچانتا ہو لیکن پاکستان میں شاید ہی کوئی شعبہ زندگی ایسا ہو جس کے کسی نہ کسی فرد کی شناسائی یا رسائی ان تک نہ ہو۔ فلم اسٹارز، پی آئی اے کریو (Crew) سرکاری ملازمین، بزنس مین، سمگلرز، طالب علم، تبلیغی جماعتیں غرضیکہ ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول اور مشہور ہیں اور حسب ضرورت ان کے مدد اور معاون بھی ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر فلم انڈسٹری اور پی آئی اے والوں کے تو یہ گرو ہیں۔ پی آئی اے کے کسی کیپٹن، انجینئر یا ایئر ہوسٹس کا بنکاک آکر انہیں پرنام کئے یا کچھ سلوائے بغیر گزر جانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی ٹرک ڈرائیور کسی پیر فقیر کے مزار پر چڑھاوا چڑھائے بغیر نکل جائے۔ تمام سٹاف کے نام، ان کی عمریں، خاندانی مسائل، ترقی کی تاریخیں، ایئر کرافٹ کی قسمیں، مشاغل انہیں زبانی یاد ہیں۔ پیار سے سب کو بیٹا، بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں، چاہے کسی کی عمر ان کے چاچا جی کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ جس دن فلائٹ نے بنکاک آنا ہو دکان کے عملے کی شامت آجاتی ہے۔ حکم پہ حکم چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی سیکرٹری کو قریباً ڈانٹتے ہوئے کہیں گے ''دیکھو میرا بیٹا ناصر جمبو لے کر آ رہا ہے کھانا بروقت تیار ہونا چاہئے اور چائے فرسٹ کلاس۔ ایک دم کڑک!'' پٹی کو بار بار یاد کرائیں گے۔ وہ ریشم کی ساڑھیاں ابھی تک نہیں پہنچیں۔ بیٹی نسرین کراچی سے چھ بار فون کر چکی ہے۔ کیا سوچے گی؟ لمحے لمحے گھڑی کی طرف دیکھیں گے۔ انکوائری سے استفسار کریں گے۔ کرسی پر ان کی اُچھل کود اور اضطراری کیفیت سے کچھ ایسا تاثر ملے گا جیسے جہاز کا نہیں انہیں اپنی دھرم پتنی پرکاش کور کا انتظار ہو۔

عزم و ہمت کے دھنوان، پیار اور محبت کے بھگوان، یاروں کے یار، مخلص و غم خوار، درمیانہ قد، گندمی مائل کھلتا ہوا رنگ، سفید چمکیلے دانت، مضبوط جبڑے، امرجیت سنگھ ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔ گزشتہ تیس سال سے بنکاک میں مقیم ہیں۔ ان کی شخصیت، محنت، ہمت، لگن، ایثار، خوش اخلاقی اور مزاح سے عبارت ہے۔ ان ساٹھ سالوں میں اس خالصے نے تاریخ بھی دیکھی ہے اور جغرافیہ بھی، پیار بھی پایا ہے اور نفرتیں بھی سمیٹی ہیں۔ مفلسی، تنگ دستی اور عسرت کے جہنم زار سے ہوتا ہوا سیم وزر کے گلزار میں آنکلا ہے لیکن اپنے ماضی کو نہیں بھولا۔ ایاز کی طرح اس نے اپنی یادوں کی گٹھڑی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے اور اکثر اپنے ماضی کے دریچوں میں سے جھانکتے

ہوئے اسے پہن لیتا ہے اور کسی قسم کی خجالت یا شرم محسوس نہیں کرتا۔ ایک دن کہنے لگا "مجھے وہ دن نہیں بھولتے جب گرمیوں کے دنوں میں ہم گاؤں کے لڑکے شرط باندھ کر پیدل سکول جایا کرتے تھے۔ ماسٹر قائم دین کتنے پیار اور توجہ سے ہمیں پڑھاتا تھا۔ واپسی پر جب ہم ہانپتے ہوئے ماسی بختاں کے گھر کے سامنے سے گزرتے تو وہ اکثر ہمیں بٹھل میں گڑ کا شربت پلایا کرتی تھی۔ ہر بچہ گاؤں کا بیٹا تھا۔ ہر لڑکی گاؤں کی عزت تھی۔ گاؤں کے لوگ خوشیوں میں شریک ہو کر انہیں بڑھا دیتے تھے، دکھوں کو بانٹ کر بوجھ ہلکا کر دیتے تھے۔ کیسا وقت تھا، عجیب وقت تھا۔ مہاراجہ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ "جب غریبی گالی نہیں تھی، طعن نہیں بنی تھی۔ طنز کا بوجھ نہیں بن پائی تھی۔ ہر طرف محبتوں کے انبار لگے تھے۔ نفرتوں کے معیار مختلف تھے۔ اب سب کچھ ہے لیکن کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے "ایک نگر انسان باہر بناتا ہے ایک بستی من کے اندر بنتی ہے۔ جب من میں کھنڈر سما جائیں تو پھر ظاہری چمک دمک سکون نہیں دیتی۔" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگے "تم شاید یہ باتیں نہ سمجھ سکو یا پھر مجھے خبطی خیال کرو گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج بھی بنکاک کی چمکیلی تارکول سے بنی ہوئی سڑکیں دیکھ کر مجھے ماناں والا کے وہ کچے راستے یاد آتے ہیں جن پر چاچا امام دین کا گڈا گرداڑایا کرتا تھا۔ اس مٹی کی پوتر تا سونے کے ان مندروں سے کہیں زیادہ ہے جہاں مہاتما بدھ کو قید کر دیا گیا ہے۔ میر و مراثی کے ڈھول کی تھاپ کے تصور سے آج بھی میرا بایاں پاؤں اور دونوں ہاتھ رقص کے انداز میں اُٹھ جاتے ہیں۔" "خالصہ کچھ نہیں بولتا" خالصہ کچھ بھی تو نہیں بھولتا۔ مہاراجہ ایک لمبی سانس لے کر بولے۔

مہاراجہ سے میری ملاقات اتفاقی تھی اور دوستی حادثاتی۔ میں ان دنوں ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر کورس کر رہا تھا۔ میرے دوست استاد جوش بظاہر مجھ سے ملاقات کے لئے تھائی لینڈ آ پہنچے۔ کہنے لگے "تم تنہائی سے اُکتا گئے ہو گے، اس لئے سوچا کیوں نہ تمہیں چند دن کمپنی دی جائے۔ ویسے بھی تم جانتے ہو کہ ہم احباب کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتے۔" استاد کی افتادِ طبع کو جانتے ہوئے اور ان کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے بھی ہم نے شکریہ ادا کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اُستاد کو غالباً گمان بھی نہیں تھا کہ ان کا دوست واقعی تنہائی کا اسیر ہے اور بنکاک سے پچاس کلومیٹر دور ایک خشک سی درس گاہ میں ایک نہایت ہی خشک اور تھکا دینے والا مضمون پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ پہلے دن ہی انہوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ کہنے لگے "دیکھو! تم سے تکلف تو کچھ ہے نہیں، میں محسوس کر رہا

ہوں کہ میرے آنے سے تمہاری پڑھائی میں خلل پڑ جاتا ہے۔ کل خدانخواستہ تم فیل ہوگئے تو ہر کوئی مجھے مورد الزام ٹھہرائے گا۔
اس کا خیال تو آپ کو آنے سے پہلے کرنا چاہئے تھا۔ میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔
ہنس کر کہنے لگے ”نیکی کا خیال جس وقت بھی آجائے اچھا ہے۔“
”تو کیا آپ نے ساری نیکیاں بنکاک کے لئے وقف کر دی ہیں؟“
”یار تم ”گل“ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے“ استاد نے اپنے ترکش کا سب سے مؤثر تیر چھوڑا۔
تیسرے دن جوش کا بنکاک سے فون آ گیا۔ کہنے لگے ”فوراً بنکاک پہنچو! تمہیں ایک دلچسپ خالصے سے ملوانا چاہتا ہوں“ عرض کیا ”سکھ تو سارے ہی دلچسپ ہوتے ہیں“ نہیں یہ خالصوں کا خالصہ ہے، جوش اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولے۔ تھوڑی سی لیس و پیش کے بعد میں نے ان سے وعدہ کر لیا۔ دراصل جوش مہاراجہ کی دکان سے فون کر رہا تھا اور ہمارے درمیان ہونے والی بات چیت براہ راست سردار جی کے حلق میں اتر رہی تھی۔ کوئی شخص ملنے میں اس قدر تامل کرے، یہ انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ میں جب دکان پر پہنچا تو جوش میرا منتظر تھا۔ امرجیت سنگھ سے تعارف ہوا تو ان کے لب ولہجہ اور ہینڈ شیک میں وہ حرارت نہ تھی جس کا تقاضا اُستاد کا اشتیاق کر رہا تھا۔ مجھے قریباً نظرانداز کرتے ہوئے جوش سے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے بھی اسی سردمہری کا مظاہرہ کیا اور کچھ دیر بعد واپس اے آئی ٹی چلا آیا۔ جوش کی وجہ سے ان سے بامر مجبوری ملاقات ہو جاتی لیکن سرد اعصابی جنگ جاری رہی۔ آخر ایک دن مہاراجہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”تمہارا دوست مجھے پسند نہیں آیا“
”وہ کیسے؟“ اُستاد نے انہیں چھیڑتے ہوئے پوچھا۔
”کئی دن سے اس نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں کھل کر بات ہی نہیں کرتا۔“
”آپ نے اسے موقع ہی کب دیا ہے“ جوش نے وضاحت کی، آپ کو غالباً علم نہیں کہ یہ ننکانہ صاحب میں تین سال اسسٹنٹ کمشنر رہا ہے۔ بابا گرونانک کے تمام گردواروں کا انتظام و انصرام حفاظت و رکھوالی، سکھ یاتریوں کی سیوا اور آؤ بھگت، اس کے فرائض میں شامل تھا۔ آپ کی جنم بھومی ماناں والا بھی اس کی عملداری میں رہی ہے۔ اگر آپ نے پورن ماشی کی رات کو گردوارہ جنم استھان میں، گرونانک کی شخصیت پر اس کی روح پرور تقریر سنی ہوتی تو ابھی تک اپنے اس خالصائی سنگھاسن پر یوں تک کر نہ بیٹھے ہوتے“۔ جوش کے الفاظ ایک وزنی ہتھوڑے کی طرح مہاراجہ کے

حواس پر گرے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے اور اپنی داڑھی پر ہلکا سا چپت رسید کرتے ہوئے بولے ''اوئے امر جیت سیاں تو بندے پہچاننن وچ ہمیشہ غلطی کیتی اے، اُٹھ کر مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ اوئے مینوں تاں پہلے دن ہی شک سی کہ کوئی گل ضرور اے'' اور پھر روتے روتے مسکرا دئے۔

جیسے جیسے مہاراجہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا ان کی شخصیت کے پرت کھلتے گئے۔ امرجیت سنگھ نے مانانوالہ سے لے کر بنکاک تک ایک طویل فاصلہ طے کیا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کا خاندان ہندوستان منتقل ہو گیا۔ تلاش معاش میں شہر شہر پھرتے رہے۔ دہلی سے آگرہ گئے۔ آگرہ سے بنارس، بنارس سے بمبئی پھر امرتسر، آخر تھائی لینڈ کے شمالی صوبے چنگ مائی میں آ کر پناہ لی۔ جب معاشی طور پر کچھ سنبھلے تو ایک مقامی سکھ کی بیٹی سے شادی کر لی جس کی ماں تھائی تھی۔ یہیں سے ان کی قسمت نے پلٹا کھایا اور جب امریکنوں نے ویت نام میں جنگ شروع کی تو پلٹے پہ پلٹا کھانے لگی۔ کسی طرح ان کی رسائی امریکی فوج تک ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا۔ ان کی چرب زبانی نے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔ تمام افواج کی وردیوں کا ٹھیکہ انہیں مل گیا، ڈالر تو خیر اکٹھے کرنے ہی تھے، ساتھ ساتھ چھ ستارے بھی سمیٹ لائے۔ اپنے، چھ ستاروں کی کہانی سناتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ایک دن میں چیک وصول کر کے آ رہا تھا کہ ویسٹی نے کہا امرجیت آج رُک جاؤ۔ رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے صدر نکسن آ رہا ہے۔ ہر چند کہ اس روز میں کافی مصروف تھا لیکن اپنے بلڈ براور ویسٹی کی درخواست کو رد کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔''

''ویسٹی کون ہے؟'' ہم نے استفسار کیا۔

''ارے تم ویسٹی کو نہیں جانتے'' سردار جی نے عجیب ترحم آمیز نظروں سے ہمیں گھورا۔ ویسٹی دی گریٹ۔ جنرل ویسٹ مورلینڈ۔ ویت نام میں امریکی فوجوں کا کمانڈر۔ سردار جی نے دیوار پر لٹکے ہوئے چند فریم شدہ خطوط کی طرف اشارہ کیا جو بقول ان کے ویسٹ مورلینڈ نے انہیں لکھے تھے۔

''ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا اس دعوت کا، مہاراجہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے ''موسم اتفاقاً مہربان تھا۔ (Pacific) کمانڈ کے قریباً سبھی جرنیل موجود تھے۔ ویک اینڈ ڈنر تھا۔ وسکی کے جام پہ جام لنڈھائے جا رہے تھے، ایسے پتہ چلتا تھا کہ پینکی پی نہیں رہے اس میں نہا رہے ہوں۔ باہر آرمی کا براس بینڈ عسکری دھنیں بجا رہا تھا۔ نکسن خلاف معمول بہت خوش نظر آتا تھا۔ سب جرنیلوں سے ہاتھ ملا کے جب میرے نزدیک آیا تو حیرت سے میری پگڑی اور داڑھی کو دیکھا اور پھر ویسٹی کو استفسار بھری نظروں سے گھورا۔ ''میٹ مائی

بلڈ برادر! امرجیت سنگھ آف بنکاک" ویسٹی نے میرا تعارف کرایا۔
"اوہ آئی سی!" نکسن حافظے پر زور دیتے ہوئے مسکرایا۔
"If he is your blood brother, He is mine too."
(اگر یہ تمہارا بھائی ہے تو میرا بھی ہے)
اس کے بعد نکسن سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ساتھ ساتھ جام چلتے رہے۔ بین الاقوامی امور، ویت نام میں ملٹری سٹرٹیجی، کچھ ذاتی باتیں، پیتے پیتے نکسن ترنگ میں آ گیا اور ایک ایسی بات کہہ بیٹھا جو پرانی کہانیوں میں بادشاہوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ نشے میں آ کر کہنے لگا "مائی بلڈ برادر امرجیت سنگھ۔ مانگ کیا مانگتا" میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اگر یہ بات امریکن کانگریس تک پہنچ جاتی تو یہ نیک بخت چند سال پہلے ہی (Impeach) ہو گیا ہوتا۔ جب میں نے حیران نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا "مانگ کیا مانگتا"
بس وہ ایک لمحہ تھا، فیصلہ کن! میں نے مسکرا کر کہا "سوچ لو"
ہنس کر کہنے لگے "آج کل ہم امریکیوں نے بھی خالصوں کی طرح سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"
"تو پھر مجھے جرنیل بنا دو۔ امریکی فوج کا جرنیل۔" نہ جانے ایک مدت سے لاشعور میں اٹکی ہوئی بات کیسے زبان پر آ گئی۔
نکسن کی ہنسی ایک دم رُک گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے غصے اور تاسف بھری نظروں سے مجھے دیکھا، پاس کھڑے ہوئے ویسٹی نے گھبراہٹ میں سگار پینے کی بجائے چبانا شروع کر دیا، خیالات کی ایک برقی رو تھی جس نے اس کے تمام چہرے کو تپا سا دیا لیکن پھر اچانک بالکل اچانک ہی اس نے ایک وزنی سا قہقہہ لگایا۔

Amar Jeet Sigh, you are a jolly good fellow, I appreciate your sense of humour, from now onward, You are honorary six star general of the US army.

(امرجیت سنگھ! تم ایک زندہ دل انسان ہو۔ میں تمہاری حس مزاح کا قائل ہو گیا ہوں۔ آج سے تم امریکی فوج کے اعزازی چھ ستاروں والے جرنیل ہو)
یہ سننا تھا کہ تمام ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور سارے جرنیلوں نے کورس کی شکل میں گانا شروع کر دیا۔ For he is a jolly good fellow
وہ بات جو ہنسی مزاح میں شروع ہوئی تھی ایک ٹھوس حقیقت بن گئی اور آج میں واہ گرو کی کرپا سے امریکی فوج کا جرنیل ہوں۔
سردار جی نے دراز سے فریم کیا ہوا ایک فوٹو

نکالا جس میں یہ اپنی ہی سلی ہوئی وردی پہنے خود خرید کر وہ چھ ستارے لگائے، امریکی جرنیلوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کوئی پہاڑی ریچھ شکاریوں کے چنگل میں آ گیا ہو۔ ''اوئے اس نوں بھی دیوار تے ٹنگ دے'' سردار جی نے بنتی کو پھر آواز دی۔

''یہ بات مشہور ہے کہ آپ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔ ویسے آپ کے بطور جرنیل فرائض کیا ہیں؟'' جوش نے پوچھا۔

(یہ سربستہ راز ہے) It is classified secret سردار جی نے ایسا سکہ بند جواب دیا جس کے کوئی بھی معانی اخذ کیے جا سکتے تھے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے ''یہی تو میری کامیابی کا راز ہے۔ اگر بلی تھیلے سے باہر آ گئی تو پھر کچھ کہنے، سننے کے لئے باقی نہیں بچے گا۔''

امرجیت سنگھ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ محفل کو ہر وقت کشت زعفران بنائے رکھتے ہیں۔ اس شخص کی ظاہری سج دھج، انداز گفتگو، چال ڈھال اور ہنسی مذاق کو دیکھ کر کوئی شخص اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسان اندر سے کتنا دکھی ہے۔ بنکاک میں تفریح کے کئی ذریعے ہیں۔ سینما، ڈسکو، تھیٹر، مساج پارلر، نائٹ لائف لیکن جو مزہ ان کی باتیں سن کر آتا ہے اس کا جواب ہی نہیں۔ کیونکہ ان تمام خرافات کا نچوڑ ان میں ہوتا ہے۔ جب ان کی جولانی طبع کے جوہر کھلتے ہیں تو ان کا تخیل بہت دُور کی کوڑی لاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی یا غلو سے اجتناب نہیں برتتے۔ جنسیات پر تو انہیں خاص عبور حاصل ہے اور اس ضمن میں جب قادر الکلامی پر اُترتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈی ایچ لارنس، ہیرلڈ رابنز اور سعادت حسن منٹو ان کی چوکھٹ پر زانوئے تلمذ تہہ کیے بیٹھے ہوں۔ جزئیات بڑی تفصیل اور ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے بیان کرتے ہیں۔ ان دنوں پی آئی اے کے ایک کیپٹن ایک رات ان کی رفاقت میں گزار گئے، بس پھر کیا تھا دوسرے دن سردار صاحب نے ان کی ساری مائیکرو بیالوجی کا تقابل جمبو کے ہائیڈرالک سسٹم سے کر ڈالا۔ کہنے لگے ''یہ واحد پاکستانی تیل ہے جو بنکاک کی ساری کراکری توڑ جاتا ہے۔'' جوش کو پیار سے بوڑھا بیٹا کہتے تھے۔ ایک دن جوش کو دعوت دیتے ہوئے بولے ''بیٹا جی! آج شام آپ میرے مہمان ہیں''

''کیوں تکلف فرماتے ہیں'' جوش نے رسماً معذرت کی۔

''تکلف کی بات نہیں'' سردار جی غرائے ''میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ تمہارے ڈیڈی کی بوڑھی ہڈیوں میں اب بھی کتنا رس ہے۔''

''جوش کو ان کی دعوت قبول کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔ دوسری صبح جب میری ان سے

ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا ''کیسی رہی آپ کی دعوت اور کدھر ہے آپ کا بیٹا؟''

''مت کہو اسے میرا بیٹا'' سردار جی کی داڑھی کے پیچھے ان کے سفید دانت چمکنے لگے۔ او میرا پیو ای......''

جتنی دیر آدمی مہاراجہ کے پاس بیٹھتا ہے اسے محسوس نہیں ہوتا کہ وہ پنجاب سے باہر ہے۔ حاضرین پر ایک ایسی کیفیت طاری کر دیتے ہیں کہ انہیں اپنی ساری کلفتیں کوسوں دور دکھائی دیتی ہیں اور اس کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کرتے۔ کوئی شخص بھی انہیں ملنے آجائے بغیر چائے بسکٹ کے اسے جانے نہیں دیں گے اور چائے بھی اپنی اس پرسنل سیکرٹری کے ہاتھوں سے پلوائیں گے جسے دیکھ کر خون کی گردش ویسے ہی تیز ہو جاتی ہے۔ باوجود تمباکو سے نفرت کے جی کڑا کر کے دراز سے سگریٹ کی ڈبیا نکالیں گے اور مہمان کو تھماتے ہوئے کہیں گے ''معاف کرنا۔ سگریٹ خود نکال لو میں تمباکو کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

دنیا کا شاید ہی کوئی کونہ ایسا ہو جہاں سے کوئی نہ کوئی آدمی ان سے ملاقات کے لئے نہ آتا ہو۔ جب بھی کوئی ملاقاتی اپنی ڈائری کے ورق کھولتا ہوا ان کے کیبن میں داخل ہوتا ہے اور احتیاطاً پوچھتا ہے امرجیت سنگھ آپ ہی ہیں۔ تو آ ہو، کہہ کر سردار جی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کو جپھا ڈال لیتے ہیں۔ ان کی یہ عادت اس حد تک راسخ ہو چکی ہے کہ بعض اوقات بے خیالی میں صنف نازک کو دیکھ کر بھی ان کے ہاتھ کندھوں تک اُٹھ جاتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ان کی دھرم پتنی پرکاش کور کا جو اس موقع پر ان کی راہ نمائی کرتی ہے اور پیچھے سے ان کی ڈھیلی ڈھالی پتلون کو پکڑتے ہوئے انہیں کرسی پر بٹھا دیتی ہے۔ نووارد کے بیٹھتے ہی سردار جی بڑی بے تکلفی سے اس کا حال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ڈائری پر نوٹ بھی لیتے جاتے ہیں۔ کب آئے؟ کیسے آئے؟ کہاں ٹھہرو گے؟ کھانا کس قسم کا پسند کرتے ہو؟ اس کے بعد اس کی رہبری کرتے ہوئے سستے ہوٹل، سستے ریسٹورنٹ اور سستے مساج پارلر کا پتہ بتائیں گے اور دراز سے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر اسے دیں گے تاکہ مناسب رعایت ہو سکے۔ اس انٹرویو کے دوران ان کی لاڈلی سیکرٹری وزدیدہ نگاہوں سے مہمان کو تکتی، تھرکتی، لچکتی ہوئی گرم گرم چائے لے کر آجائے گی۔

سردار جی اس سے تھائی زبان میں چند باتیں کریں گے اور پھر مترجم کے فرائض سنبھالتے ہوئے مہمان کو بتائیں گے'' یہ تمہاری شخصیت سے بہت مرعوب ہے اور تمہاری بڑی تعریف کر رہی ہے'' ایک دن ان کی دھرم پتنی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا'' سردار جی! یہ آپ کیا فضول سی حرکت کرتے ہیں۔''

[جاری ہے۔]

ہماری نسل کا بچپن صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کی چھتر چھاؤں میں

ماہ فروری کے اختتامی دنوں میں گئے گوڈوں کو اپاہج کرنے والی سردی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اس سہ پہر جب فضا میں بہار کے رنگ امنڈتے دکھائی دیتے تھے۔ بھاٹی دروازے کی طرف جاتے ہوئے مجھے دفعتاً عوامی لوگوں کے چلتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے ہجوم نے ان تہواروں کی یاد دلائی تھی جو ان موسموں سے جڑے ہوتے تھے جو لاہور کی پہچان اور اس کے ثقافتی کلچر کا طرۂ امتیاز تھے۔ اب بھلا ان کے ساتھ جڑے ہوئے صوفی تبسّم کیوں نہ یاد آتے۔ وہ آئے اور میری آنکھوں کو نم کرتے ہوئے میرے ہونٹوں کو بھی متحرک کر گئے کہ میں اُن کی وہ خوبصورت نظم ''میلہ شالامار کا'' گنگنانے لگی تھی جو اسی سلسلے کی ایک خوبصورت لڑی تھی۔

دہقانوں کی ٹولیاں
گاتی آئی بولیاں
آؤ منائیں شوق سے
میلہ شالامار کا

.....

نظم کے بقیہ بند مجھے دھیرے دھیرے یاد آ رہے تھے۔ بچپن کی رومینٹک فینٹسی کا سارا حسن اردگرد یادوں کی مہک کے ساتھ پھیل گیا تھا۔

یقیناً یہ میرا وہ قلبی تعلق تھا کہ صرف دو دن بعد ڈاکٹر فوزیہ تبسم اُن کی پوتی نے مجھے فون کرتے ہوئے کہا ''گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور صوفی تبسّم پر کانفرنس کر رہا ہے۔ آپ اُن پر کچھ بولنا چاہیں گی۔'' ''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میرا بچپن مقروض ہے ان کا۔'' ۱۱ مارچ کی صبح سٹیج وائس چانسلر اصغر علی زیدی، ایرانی کونسلرز اور یونیورسٹی کے قابل فخر استادوں سے سجی ہوئی تھی۔

پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر فوزیہ تبسم کی بیٹی نے ایک ڈاکومینٹری دکھائی تھی۔ نوجوان بچوں کو صوفی تبسم بارے کچھ علم نہ تھا دُکھ ہوا۔ ایسا کیوں؟ یہ سوال میں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر حاضرین سے پوچھا تھا اور کہا تھا کہ ہال میں موجود بیشتر عمر رسیدہ لوگوں نے یقیناً اپنے بچپن

سلمیٰ اعوان

میں لہک لہک کر صوفی تبسم کی نظمیں پڑھی ہوں گی جو میری طرح آپ کی یادوں میں بھی ٹکڑوں کی صورت کہیں محفوظ ہوں گی- تو چلیں نا چند لمحوں کے لیے اس دنیا میں:

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ
باپ تھا اس کا میر سلوٹ
پیتا تھا وہ سوڈا واٹر
کھاتا تھا بادام اخروٹ
صبح کو ہوتا کلکتے میں
شام کو ہوتا چڑیا کوٹ

1968 سے پہلے تک میری اُن سے براہ راست شناسائی نہ تھی- پہلی شناسائی اُن کی بیٹی کے حوالے سے ہوئی- جو پاک فضائیہ لاہور بیس کے سکول کی سربراہ کے طور پر کام کرتی تھیں اور جہاں میری تقرری ایک استاد کے طور پر ہوئی تھی- چند دنوں بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ صوفی تبسم کی بیٹی ہیں تو جیسے میں خوشی سے نہال ہوئی- لو پیاری سی نظم "ثریا کی گڑیا" ہنستی مسکراتی کدکڑے لگاتی سامنے آ گئی اور مجھے گنگنانے پر مجبور کر دیا- میں نے اپنی باس کے سامنے کھڑے ہو کر اس محبت کا عملی اظہار کیا اور اُن سے کہا" آپ کتنے عظیم آدمی کی بیٹی ہیں-"

اب میں ذرا ذاتی ملاقاتوں کی طرف آتی ہوں- پہلی ملاقات ریڈیو پاکستان میں ہوئی- پروگرام پروڈیوسر جناب باسط صاحب سے ملنا تھا- وہاں صوفی صاحب بھی موجود تھے- اخباری جھلکیوں والے صوفی صاحب ذہن میں تھے- یہاں جو صوفی صاحب ملے- ماشاء اللہ اُن کا سُرخ و سفید چہرہ بالوں کی جھالروں میں لشکارے مارتا تھا- میں کھڑی ہو گئی اور "نہر میں اک دن لگ گئی آگ، پھوں پھوں کرتا نکلا ناگ، چوں چوں چاچا، ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی" جیسی ساری نظمیں جوش و خروش سے انہیں سنا دیں- میری آنکھوں سے چھلکتی خوشی اور مسرت سے انہوں نے لطف اٹھایا- میں نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے اُن کے ہاتھ تھامے اور بولی "صوفی صاحب میرے بچپن کی ساری رنگینیاں آپ سے جڑی ہوئی ہیں- آپ کی عظمت کا احساس مجھے شعور آنے پر ہوا- اس ملک کا کون سا ایسا ادیب ہے جس نے بچوں کی نفسیات کو سمجھا- یہ بچے ہی تو ہیں جن کے گھوڑے آسمانوں میں رقص کرتے ہیں- جو نہر کے پانیوں میں آگ لگتی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں- پریاں اور دیو جن کے دوست اور دشمن ہیں- کیا کسی نے غور کیا کہ ان نظموں میں موسیقیت کی جو جھنکار ہے وہ بچوں کی کتنی بڑی نفسیاتی ضرورت کی تسکین ہے- ان کا ترنم، ان کی نغمگی، ان کا موضوع سب کا گہرا تعلق بچوں کے مزاج، اُن کی خواہشات، اُن کے عمری رجحانات اور اُن کی معصومانہ آرزوں کی عکاسی ہیں-

جنہیں یہ بڑے لوگ جانتے ہی نہیں اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے بچوں کو حقیقت پسند بنائیں۔ صوفی صاحب آپ بتایئے نا زندگی کے رگڑوں اور ٹھڈوں نے انہیں حقیقت پسند بنا ہی دینا ہے۔ یہ لوگ بچوں سے ان کا بچپن بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔''

صوفی صاحب زندہ ہوتے تو میں انہیں وہ واقعہ ضرور سناتی کہ جب الف لیلیٰ کی کہانیاں پڑھ کر میں خود کو شہرزاد خیال کرتی۔ ہر رات شہریار کی خوابگاہ میں داخل ہونے اور اُسے کہانی سنانے والی میں ہوتی۔ **2008** میں جب بغداد گئی دجلہ کے کنارے شہریار کے کالے کلوٹے مجسمے کو دیکھ کر اتنا ہنسی تھی کہ آنکھوں سے آنسو صاف کرنے پڑ گئے تھے۔ ''لو میں بھی نری الو کی پٹھی تھی۔''

اب جب بھی ریڈیو سٹیشن جانا ہوتا میں کوشش کرتی کہ صوفی صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ بہت پیارے بڑے کھلے ڈلے، لگی لپٹی کے بغیر بات کرنے والے۔ **1977** میں، اردو ڈائجسٹ میں ملازمت شروع کی۔ اس وقت دفتر سمن آباد میں تھا۔ سمن آباد میں ہی صوفی صاحب کا نیا گھر تھا۔ اپنی ایک دوست کے ساتھ اُن سے ملنے چلی گئی۔ سرخ ہارڈ اور سبز و سفید خانوں والی لینن جیسے کپڑے والی لنگی پہنے حقے سے شغل کر رہے تھے۔ حقہ کی نے اک ذرا منہ سے نکالتے ہوئے دیکھ کر ہنسے۔ میں نے انہیں اپنی جاب کا بتایا۔

''کبھی عابد علی عابد کے گھر بھی گئی ہو پوچھا۔ وہ وہیں تمہارے علاقے میں ہی تو رہتے ہیں۔'' ''ہاں رہتے تو ہیں۔ بنسی والے تالاب کے پاس۔ اُن کی بیٹی شمع میری کالج فیلو تھی۔ بڑی بددماغ اور مغرور۔ گھر دیکھے ہوئے ہوں مگر اندر نہیں گئی کہ مجھے اُن سے محبت نہیں۔'' بہت ہنسے۔ چائے پلائی باقر خانی کے ساتھ۔

مجھے محکمہ تعلیم کے ارباب اختیار سے بھی یہ پوچھنا ہے کہ انہوں نے صوفی تبسم کی نظموں کو بچوں کے نصاب میں اونٹ کے منہ میں زیرے جیسی صورت کے ساتھ داخل کر رکھا ہے۔ کیوں بھلا۔ یہ صورت بھی صرف گورنمنٹ سکولوں میں ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اور مہنگے سکولوں کی اردو کتب میں تو اُن کا حصّہ رائی برابر بھی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے آج کے بچوں کو اس عظیم ہستی کا نام تک نہیں معلوم۔ ہے نا المیہ۔ میں لمز جیسے ادارے کے بانی بابر علی کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے اِس کانفرنس کو منعقد کروایا۔ بہت مشکور ہوں جناب علی اصغر زیدی صاحب کی، جناب معین الدین نظامی صاحب، ڈاکٹر عمر عادل اور ڈاکٹر فوزیہ تبسم کی کہ انہوں نے میری محبوب شخصیت کے بے شمار گوشوں پر بات کی جن سے میں نا آشنا تھی۔

☆☆☆☆☆

نیشِ عشق [افسانوی مجموعہ]

غافر شہزاد

بارہ افسانوں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کے لیے بارہ صدیاں انتظار کرنا پڑتا ہے، بارہ کرداروں کی زندگیاں جینا پڑتا ہے، بارہ شہروں کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے، بارہ وادیوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے، بارہ کوس کا راستہ ناپنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر بارہ کہانیاں ہاتھ لگتی ہیں مگر قاری افسانوی مجموعے کو چھ گھنٹوں میں پڑھ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ کتاب لکھنا اور پڑھنا، دو مختلف عمل ہیں۔ تخلیق اور قرات کا یہ عمل وقت کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ کے تجربے کا نام ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ وقت کے پھیلاؤ کا انتخاب کرتے ہیں یا آپ کی ترجیحات میں وقت کا سمٹاؤ ہے۔ ڈاکٹر اظہار ہاشمی کہ جو پیشے کے اعتبار سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر اور کینسر سپیشلسٹ ہونے کے ساتھ ''اخوت'' کی مرکزی قیادت کا حصہ بھی ہے، نے اپنے لیے وقت کے پھیلاؤ کا انتخاب کیا ہے، اسی لیے وہ ''نیشِ عشق'' تخلیق کر پایا ہے۔ اس سے اگلا مشکل کام یہ کیا ہے کہ اپنی سہولت اور قاری کو کہانی کے گنجھل سے بچانے کے لیے اس نے کرداروں کے نام رکھے ہیں مگر ہر کہانی

میں وہ ''میں'' بن کر خود کو کہانی کا حصہ بنالیتا ہے جو ایک بڑا رسک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پڑھنے والا اسے خود نوشت سمجھ کر پڑھنے لگتا ہے اور بیان کی گئی حقیقتوں کو ''میں'' کی زندگی میں کہیں نہ کہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے افسانے کا کینوس بہت محدود ہو جاتا ہے۔ بارہ صدیوں پر پھیلے وقت کو قاری چھ گھنٹوں میں سمیٹنے کی کوشش میں ان گہرائیوں اور گیرائیوں سے محروم ہو جاتا ہے جو افسانہ نگار نے بین السطور دفن کی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر اظہار ہاشمی کی بارہ کہانیاں، چھ گھنٹوں میں پڑھی تو جا سکتی ہیں مگر ان کہانیوں کے کرداروں اور موضوعات سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ ڈاکٹر اظہار ہاشمی نے کہانی لکھنے کے بجائے کہانی کہنے کی تیکنیک کو اپنایا ہے۔ وہ کہانی کا آغاز یوں کرتا ہے کہ قاری اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑتا ہے۔ تب تک قاری کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ اپنی کہانی بیان کرنے جا رہا ہے یا اپنے سے ٹکرائے ہوئے کسی کردار کی کہانی سنانے والا ہے۔ قاری کے ساتھ اس کا یہ ربط ایسا غیر محسوس طریقے سے بنتا ہے کہ کہانی اور اس کے کرداروں کے ساتھ دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، اس نے کہانی کہتے ہوئے ڈرامے کی تیکنیک ''تحیر'' کو بھی استعمال کیا ہے۔ کئی کہانیوں کے آخر میں ایسی حقیقت کا انکشاف اچانک ہوتا ہے کہ قاری تحیر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر اظہار ہاشمی کے پاؤں میں چکر ہے، وہ ہر وقت سفر میں رہتا ہے۔ اسی سفر کے دوران اسے کہانیاں ملتی ہیں، کردار ملتے ہیں جو اپنی زندگی کے نشیب و فراز کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اسے کہانی کہنے کا فن آتا ہے، سو وہ حاصل معلومات کی خالی جگہیں پر کرنے کے بعد انہیں کہانی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسے اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب وہ راستہ بھولتا ہے یا خلاف معمول کسی جانب جا نکلتا ہے تو اصل بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی کردار اسے اپنی جانب کھینچ رہا ہوتا ہے تا کہ وہ اسے کہانی سنا سکے۔

ان کہانیوں کو اگر بغور پڑھیں تو یہ کردار ڈاکٹر اظہار ہاشمی کے اپنے نظریہ حیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ زندگی میں اگر کوئی شخص آپ سے ٹکراتا ہے تو ایک حقیقت جنم لیتی ہے۔ اس حقیقت میں آپ نے کسی دوسرے کی مشکل کو حل کرنے کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے خدائی مدد ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں بھی واقعات کا تانا بانا ایسے ہی بنا گیا ہے۔ ڈاکٹر

اظہار ہاشمی کو دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اللہ مسبب الاسباب ہے، جب کوئی پریشانی یا بیماری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ معاشرے کے صالح کردار ہیں جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے ہیں اور پھر چوں کہ اللہ ان کے لیے بھی رحیم و کریم ہے اس لیے ان کی مدد کے اسباب بھی پیدا کرتا رہتا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کرداروں کا رویہ درویشانہ ہے۔ کہیں بھی وہ حرص و ہوس کی دوڑ میں غیر انسانی سطح پر نہیں اترتے۔ دولت و شہرت سے ان کی کوئی رغبت نہیں ملی کہ کئی جگہوں پر وہ "حیطۂ عظمت" کی ترکیب بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ صابر اور قانع کردار ہیں، مشکل حالات میں ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کہیں بھی اللہ تعالیٰ سے اپنی محرومیوں کا گلہ شکوہ کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہی وہ کردار ہیں جن کے سبب معاشرے میں کچھ اعتدال باقی ہے ورنہ اپنے لیے دنیا کی آسائشیں اکٹھے کرنے والے افراد ایک نہ ختم ہونے والی اندھی دوڑ میں ہانپ رہے ہیں۔ معاشرہ اگر ڈاکٹر اظہار ہاشمی کے افسانوں کے کرداروں جیسا ہو جائے تو حقیقی معنوں میں انسانی معاشرہ بن جائے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم انسانوں میں نہیں، درندوں میں رہ رہے ہیں جہاں جنگل کا قانون رائج ہے۔ ہر طاقت ور غریب اور بے بس کے منھ سے نوالا چھیننے میں لگا ہوا ہے۔

عام انسانوں کی کہانیاں لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ افسانہ نگار کے پاس ایک توانا اسلوب ہو ورنہ عام لوگوں کی کہانیاں عمومیت کا شکار ہو جاتی ہیں اور قاری دلچسپی کھو دیتا ہے۔ میں ان افسانوں میں الفاظ اور تراکیب کے برتاؤ پر ڈاکٹر اظہار ہاشمی کی گرفت دیکھ کر بہت حیران ہوا ہوں۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں، کلاس فیلو ہونے کے سبب مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ اردو زبان و محاورہ پر اس کی دسترس ہے مگر ان افسانوں میں جس طرح کی زبان استعمال ہوئی ہے، اس نے اسے صاحبِ اسلوب افسانہ نگار بنا دیا ہے۔ اسے کرداروں کی نفسیات اور احساسات کو بھرپور طریق سے بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ اس کے پاس بیان کرنے کے لیے ابھی بہت سی کہانیاں ہیں مگر اس کی زندگی کا تحرک اور پاؤں کا چکر اسے کہیں ٹک کر بیٹھنے دے تو وہ انھیں ضبطِ تحریر میں لا سکے۔

☆☆☆☆☆

شاہد ماکلی ___ نئی جہات کا شاعر

اگر آپ غزل کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ اسے ایک سیماب صفت صنفِ سخن پائیں گے۔ کبھی بھی اس کا مزاج یکساں نہیں رہا۔ میر، غالب، اقبال، فیض اور ظفر اقبال تک آتے آتے اس نے کئی چولے بدلے۔ فیصل عجمی جیسے مظاہر فطرت اور احساسات و جذبات کی نیرنگیوں کو متشکل کرنے والے شاعر جب غزل میں در آئے تو غزل کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔ اگرچہ غزل کا بنیادی جوہر ہمیشہ محبت رہا ہے مگر ہر تازہ کار شاعر نے اس کے جوہر کو اپنے ذوق کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور بدلا۔ تلازمہ کاری کے ساحروں نے اپنے لفظوں سے رنگوں کا کام لے کر اسے ایک تھری ڈائمنشنل روپ دیا، جس میں غزل کا شعر آپ کو صرف سنائی ہی نہیں دیتا بلکہ اب دکھائی بھی دیتا ہے:

سنائی دینے سے آگے نکل گئی ہے غزل
جو سنتے وقت دکھائی بھی دے، جدید سمجھ

.....

میرے نزدیک یہ وہ عروج تھا، جو اب تک غزل نے حاصل کیا، مگر اچانک کہیں سے ایک شاعر نمودار ہوا، جس نے اپنی تلازمہ کاری سے تلازمہ کاری کے ساحروں کو بھی ششدر کر کے رکھ دیا اور وہ شاعر کوئی اور نہیں شاہد ماکلی ہے۔ غزل کی اب تک کی تلازمہ کاری انسانی جذبات و احساسات

کبیر اطہر

کے ساتھ ساتھ مناظرِ فطرت تک محدود تھی مگر اک شخص نے اسے وسعت دے کر اس دروازے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے اب اسے کائنات کے اسرار و رموز کا چوکا بھی ملتا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز ہے کہ جب بھی کوئی شخص شہرت کے طمع و لالچ کے بغیر خلوصِ دل سے اس کے قریب آیا، اس نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا اور غزل کی اس خوبی نے اسے ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔ شاہد ماکلی کی غزل میں کائنات کے اسرار و رموز پر مشتمل تلازمہ کاری اتنی برجستہ اور اتنے رچاؤ کے ساتھ متشکل ہوتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

شاہد ماکلی نے اپنی ریاضت سے اس تلازمہ کاری کو اپنے لیے اتنا سہل کر لیا ہے کہ خود اسے بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ ایسا کچھ کر رہا ہے۔ اور میرے خیال میں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا جدید سائنسی علوم کا مطالعہ اور ان سے رغبت عشق کی معراج کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ علم اس کے وجود میں رچ بس گیا ہے اور اب وہ خون کی طرح اس کے جسم میں گردش کرتے کرتے اس کے لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلیں ایک عام قاری کو بھی اپنے زبان و بیان اور مضامین کی ندرت سے اتنی ہی متاثر کرتی ہیں جتنی سائنسی شعور رکھنے والے کسی شخص کو۔ یوں تو اس کی ہر غزل میں سائنسی شعور کے حامل کئی اشعار ہوتے مگر میں صرف پانچ سات اشعار پر ہی بات کروں گا اور وہ بھی زیادہ تر ان کے سائنسی اوصاف پر، ورنہ بات بہت طویل ہو جائے گی۔ ایک شعر دیکھیں:

تنگ پڑی تو نظر آیا اک مقام پہ میں
ہٹی جو آنکھ تو آفاق بھر میں پایا گیا

....

شعر اپنی تلازمہ کاری میں اتنا مکمل ہے کہ پہلی قرأت میں ہی قاری کو جکڑ لیتا ہے اور ہر پڑھنے والا اسے اپنی زندگی کے کسی بھی تجربے سے منسلک کر سکتا ہے مگر اس شعر کا پُرلطف پہلو اس کا کوانٹم مکینکس کی کوپن ہیگن انٹرپریٹیشن سے جڑا ہونا ہے۔ یعنی یہ شعر ایک پارٹیکل اور ویو نیچر کا بیانیہ بھی ہے۔ ایک پارٹیکل صرف اس وقت تک پارٹیکل ہے، جب آپ اسے دیکھتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ ایک ویو یعنی لہر کی فارم میں ہوتا ہے۔ لیکن شاعر نے اپنے ہونے کی ویو کے دائرے کو آفاق تک پھیلا کر اسے شعریت سے بھر دیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیں:

سیاہ ہونے کو ہے روشنی کا مستقبل
سفر اندھیرے کا ہے تابناک ہونے کو

سیاہی جو کہ ایک منفی استعارہ ہے، اس کا تابناک ہونا ایک نیا زاویہ نظر ہے۔ آپ اسے اپنے ملکی حالات پر طنز بھی سمجھ سکتے ہیں اور مرنے کے بعد قبر کی زندگی سے بھی جوڑ سکتے ہیں، یا پھر اپنے کسی ذاتی تجربے سے آپ اس سے کوئی اور معنی بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ مگر اس میں جو کائنات کے اختتام کا زاویہ ہے، جس ہمارے سورج نے مر کھپ جانا ہے، ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی ہونی ہے اور بس۔ یہ معنی شاہد ماکلی کے سائنسی شعور کو دین ہے۔ اب ایک اور شعر دیکھیں:

کرن سے تیز ہے رفتار بے خیالی کی
ہماری گرد کو تارے نہیں پہنچ سکتے

.....

اس شعر میں تلازمہ کاری کا فسوں اپنے جوبن پر نظر آتا ہے اور شعر میں یہ جادو بے خیالی کے لفظ کی دین ہے۔ شاعر چاہتا تو مصرعے میں معمولی ردّوبدل سے بے خیالی کی جگہ خواب یا خیال کا لفظ بھی لگتا سکتا تھا، مگر شعر میں وہ حسن پیدا نہ ہوتا، جو بے خیالی کے لفظ نے اسے بخشا ہے، اور یہ بے خیالی نہ جانے کتنے خیالوں سے بھری ہوئی ہے جو شاعر کے ذہن سے تخلیقی عمل کے دوران گزرتے ہیں۔ اس شعر کا بیانیہ بظاہر ایک شاعرانہ تعلی لگتا ہے، مگر مستقبل میں اگر معلوم پڑا کہ کائنات میں کچھ ایسا بھی ہے، جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز حرکت کر سکتا ہے تو شاہد ماکلی "بے خیالی" کے استعارے سے اس کی پیشین گوئی کر چکا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیں:

نئے جہانوں میں لے جاتے ہیں مجھے شاہد
یہ گیارہ شعر ہیں گیارہ جہات میرے لیے

.....

یہ شاہد ماکلی کی گیارہ شعروں پر مشتمل غزل کا مقطع ہے۔ اب تک کی شاعری شش جہات کی لفاظی سے بھری پڑی ہے مگر شاہد ماکلی کے گیارہ جہان ہیں۔ اس شعر کے قریب تر معانی تو یہی بنتے ہیں کہ اس غزل کا ہر شعر خوبیٔ خیال کے حوالے سے ایک جہان ہے اور یہ غزل گیارہ مختلف جہانوں پر مشتمل ہے۔ اب آپ آئیں اس کے اندر کائنات کے اسرار و رموز کی تلازمہ کاری پر۔ ہم اپنی فزیکل ورلڈ کو چار ڈائمینشنز میں لیتے ہیں، یعنی اوپر نیچے آگے پیچھے دائیں بائیں جبکہ چوتھی ڈائمنشن وقت کی ہے۔ تو شاہد ماکلی یہ گیارہ جہات کہاں سے لے آیا جو کہ اس کے گیارہ جہان ہیں۔ دراصل یہ گیارہ جہات کا آئیڈیا سٹرنگ تھیوری سے ماخوذ ہے جس پر کام کرنے والے مانتے ہیں کہ

ہماری فزیکل ورلڈ میں ان چار ڈائمنشنز کے علاوہ سات اور ڈائمنشنز بھی ہیں جن تک ابھی ہماری رسائی ہیں۔ ماہرین طبعیات کئی عشروں سے اس تھیوری کو ابھی تک کوئی بہت بڑا بریک تھرو ہیں ملا مگر ماڈرن فزکس کے سائنسدان سمجھتے ہیں کہ یہ تھیوری کائنات میں موجود تمام فورسز کو یونیفائی کرنے کا بہترین ماڈل ہے۔ سو یہ گیارھویں جہت دراصل سٹرنگ تھیوری کے حوالے سے ایک تلمیح ہے، جس کو فزکس کا شعور رکھنے والا کوئی شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تلمیح کے حوالے سے ایک اور شعر دیکھیں:

چلو شش جہت سے نکلیں، کسی گیارھویں جہت کو
ذرا اس کا بھید سمجھیں، جو وہاں گزر بسر ہے

نیچے دیئے گئے شعر میں کسی اور جہان میں اپنے ہمزاد کی موجودگی کا یہ بیانیہ بھی کوانٹم مکینکس کی مینی ورلڈز انٹرپٹیشن سے جڑا ہوا ہے۔

کہیں مثلِ آئینہ ہیں، متوازی کائناتیں
وہاں ایک آدمی ہے، جو ہماری شکل کا ہے

اور یہ شعر دیکھیں جو کوانٹم مکینکس کے ایک اہم نام اروِن شروڈنگر کے تھاٹ ایکسپریمنٹ کا احاطہ کرتا ہے:

کبھی خبر لے اس آرزو کی، جو قید ہے غم کے ساتھ دل میں
جو بلّی ڈبے میں بند ہے، دیکھ زندہ بھی ہے کہ مر گئی ہے

اور اس ایکسپریمنٹ کی پوری امیجری اس شعر میں موجود ہے: دل ایک ڈبہ آرزو ایک بلی، غم ایک زہر کا تشبیہاتی اور تقابلی اظہار ہے۔ اس ایکسپریمنٹ کی تفصیل لکھنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص اس میں دلچسپی رکھتا ہو تو گوگل پر سرچ کر سکتا ہے۔

اور یہ شعر دیکھیں جو ایک چمکنے والی جیلی فش کے جین کو ایک خرگوش کے ڈی این اے میں داخل کر کے جیلی فش کی طرح خرگوش کو جگمگاہٹ سے بھرنے کے تجربے کی طرف اشارہ کرتا ہے:

جگنو کا جین پیڑ میں داخل کیا گیا
ہر شاخ جلتی بجھتی رہی رات بھر مری

بٹر فلائی ایفیکٹ کی تمثال کاری کرتے ہوئے یہ دو شعر دیکھیں:

سبب کی لہر ادھر ارتعاش گیر ہوئی
ادھر ابھرنے لگے واقعات میرے لیے

ایک تتلی کے پر مارنے سے ہواؤں کی لہروں میں طوفان پیدا ہوا
کیسے چھوٹے ذرّے سے کتنے بڑے ایک ذرّے کا امکان پیدا ہوا

کچھ عرصہ پہلے چارسو سے زائد ایگزوپلینٹس دریافت ہوئے جن کے نام مختلف ممالک سے مانگے گئے۔ پاکستان سے دیے جانے والے نام شمع اور پروانہ تھے اور یہ نام سولر سسٹم کے باہر گردش کرتے ہوئے دو ایگزوپلینٹس کو دیے گئے۔ اب دیکھیں، کس خوبصورتی سے دو گھسے پٹے الفاظ نئی معنویت کے ساتھ حسرت و یاس کی تصویر بنے اس شعر میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا حزن ہے اس شعر میں! جو بزم زمین کی تھی وہ اب زمین سے باہر بھی ہوئی ہے۔

نہ ڈھونڈیے کہ یہاں شمع ہے نہ پروانہ
زمیں کی بزم ہے شمسی نظام سے باہر

.....

الغرض شاہد ماکلی کی شاعری کا جہان الگ ہے، اتنا الگ کہ کوئی چاہ کر بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایسی شاعیر کرنے کے لیے جس لگ ارو جذبے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بہت خاص ہے اور اس کے سوتے اس علم سے پھوٹتے ہیں، جس کی جڑیں مستقبل میں ہیں۔ یہ آنے والے زمانوں کی شاعری ہے۔ ان زمانوں کی، جو ہماری آنے والی نسلوں کو دستیاب ہوں گے وہ نسلیں جن کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ غم بھی ہم سے مختلف ہوں گے اور خوشیاں بھی۔ جن زمانوں میں مصنوعی ذہانت کا راج ہوگا۔ چیزیں پروگرائڈ ہوں گی، شاید ہمارے جذبات بھی۔ یہ اس زمانے کی شاعری ہے جس میں گفتگو کرنا بھی شاید ایک عیاشی کے زمرے میں آئے گا۔ ہمارے اردگرد سائبورگ ہوں گے یا جینیٹک انجینئرنگ سے انسانوں کی بگڑی ہوئی شکلیں۔ ٹرانس ہیومنزم کیا کیا گل کھلا سکتی ہے، یہ سوچ کر دل دہل جاتا ہے۔

اس شاعری میں جہاں آنے والے زمانوں کے محاسن کی آپ کو فوٹو گرافی ملتی ہے، وہاں اس دور کے المیوں کی بھیانک تصویریں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ شاہد ماکلی کے سائنسی شعور کے حامل شعروں میں سے کچھ مزید اشعار دیکھیں:

بلائیں پردۂ سیمیں پہ جلوہ گر ہوں گی
نئی کہانی کی بنیادیں خوف پر ہوں گی

ہم ان میں بیٹھ کے گھومیں گے کائناتوں میں
نئی سواریاں کرنوں سے تیز تیر ہوں گی

نظامِ دہر مشینوں کے ہاتھ میں ہوگا
جدید دور کی تہذیبیں بے بشر ہوں گی

چھڑی تو پھر نہ رُکے گی حیاتیاتی جنگ
ہماری زندگی خوف میں بسر ہوں گی

اور اب تو چاند یہ آباد کاری ہونے لگی
چمکتی وادیاں انساں کا مستقر ہوں گی

یہ سب حصولِ وسائل کی دوڑ ہے پیارے
نئی لڑائیاں مریخ و ماہ پر ہوں گی

....

ہر ایک شخص کے سینے میں دھات کا دل ہے
نہ سمجھو خوبی یہاں پُرتپاک ہونے کو

نئی صفات کا انساں ظہور کرنے کو ہے
تصورِ بشریت ہے خاک ہونے کو

....

یہ مشینوں کی ہے دنیا، یہاں کام کیا ہے دل کا
نہ یہاں خدا ہے کوئی، نہ یہاں کوئی بشر ہے

....

یہ پیڑ بیج تھا، یہ ابھر بوند تھا شاہد
یہ لمحہ پھیل کے ممکن ہے عہد بن جائے

....

ہزار نوری برس پر تھا میری رات سے دن
میں آپ مٹ گیا یہ فاصلہ مٹاتا ہوا

....

کلون شہروں میں چلتے پھرتے دکھائی دیں گے
کہ آدمی کی نقول تیار ہو رہی ہے

کھڑے ہوئے تھے کہیں وقت کے کنارے پر
پھسل کے جا گرے اک اور ہی زمانے میں

....

مری تو آہ بھی شاید ہوا سے بھاری ہے
زمین تک ہی رہی، آسمان تک نہ گئی

....

میں کائناتی سفر میں اکائی تک پہنچا
فزکس ہو گئی روحانیات میرے لیے

....

مجھے دیکھنا پڑے گا کوئی دوسرا جزیرہ
یہ ہوائیں سانس بھر ہیں یہ سمندر اوک بھر ہے

....

تو پکڑتا ہاتھ میرا تو یہ دوری دو قدم تھی
نئی کائنات مجھ سے کئی نوری سال پر ہے

....

پھرتی ہے کہکشاؤں کے مرکز کے آس پاس
حیرت کہیں اندھیرے کے اندر نہ گر پڑے

....

عالم میں ہے تاریک توانائی سے پھیلاؤ
بڑھتی ہوئی دوری سے ہے وسعت مرے دل میں

....

کیا جانے آشنائی میں کتنا سمے لگے
اب تک تو اجنبی ہے بشر کائنات میں

....

دوری ہزار نوری برس کی بھی ہیچ ہے
دل دل سے رابطہ میں ہے اگر کائنات میں

دبوچ لیتا ہے دل کا سیارہ روزن اسے
قریب سے جو کوئی روشنی گزرتی ہے

.....

کائناتیں مری تشریح طلب ہیں اب تک
اک مساوات مساوات سے ٹکراتی ہے

.....

صحرا نورد ہو نہ گئے ہوں خلا نورد
وحشت کا رخ ہے دشت سے مریخ کی طرف

.....

میں تجھ کو ماضی میں جا کے ممکن ہے دیکھ پاؤں
بشر تجاذب کی لہر دریافت کر چکا ہے

.....

زمانہ ہر جگہ محتاج ہے سورج کی کرنوں کا
خلا میں کشتیاں چلتی ہیں شمسی بادبانوں سے

.....

نہ وہ لاپتہ ہوا وقت میں نہ مدار میں کہیں گم ہوا
مرا قافلہ کسی کائناتی غبار میں کہیں گم ہوا

.....

مجھے تو لگتا ہے چکھ لی ہے روشنی میں نے
کوئی چمکتا ہوا ذائقہ زبان پہ ہے

.....

یہ کائناتی ذہانت کا دور ہے بھائی
یہاں خدا کا تصور کچھ اور ہے بھائی

.....

میں اس لیے ہجوم کا حصہ نہیں بنا
سورج کبھی نجوم کا حصہ نہیں بنا

.....

جہاز اک دن سمے کے دوسرے ساحل سے پہنچیں گے
ہمارے حال تک کچھ لوگ مستقبل سے پہنچیں گے

زمین والو! رصد گاہ زماں سے دیکھتے رہنا
ہمارے عکس نوری سال کی جھلمل سے پہنچیں گے

میں خود تو ہو چکا ہوں کائناتی دھول کا حصہ
مرے ذرات تم تک گرد لا حاصل سے پہنچیں گے

غزل دل کے گراموفون پر بجتی ہوئی دھن ہے
جہاں پہنچے گی دھن، ہم بھی وہاں تک دل سے پہنچیں گے

.....

شاہد ماکلی نے ان خیالوں کو غزل کا موضوع بنایا ہے جو نظم میں بھی مشکل سے سماتے ہیں اور وہ بھی زبان و بیاں کے ساتھ، کسی کھلواڑ کے بغیر۔ اور یہ کام کوئی سچا فنکار ہی کر سکتا ہے۔ شاہد ماکلی واقعی فزکس کو روحانیات کے مقام تک لے آیا ہے۔ سو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے، کم ہے۔ آخر میں اپنا یہ شعر شاہد ماکلی کی نذر کرتا ہوں:

وہ شخص طاق ہے رنگوں کی شاعری میں کبیر
کہ اس کے ہاتھ سے ساتوں میں دل دھڑکتا ہے

☆☆☆☆☆

'مکلی میں مرگ'

اعجاز روشن

غافر شہزاد کے ناول 'مکلی میں مرگ'' کے پہلے تین صفحوں پر کئی طرح کے کچھ سماجی اور کچھ مابعدالطبیعاتی سوال اٹھائے گئے ہیں جو زندگی، موت، اور موت کے بعد زندگی سے متعلق ہیں؛ گویا ایک فلسفیانہ تمہید ہے جس کی گتھیاں ناول میں جگہ جگہ سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان سوالوں میں اہم سوال یہ ہے کہ جس طرح انسانی زندگی میں لوگوں کی شبیہہ یادوں میں زندہ رہتی ہے بعینہ موت کے بعد الفاظ، تحاریر، قوم کے ہیروز اور مذہبی شخصیات کی متبرک یادیں بھی اجتماعی لاشعور میں انمٹ نقوش قائم رکھتی ہیں بلکہ نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں، مثلاً مرکزی کردار ارسلان کے ذہن میں یہ سوال عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار کو دیکھ کر آتا ہے:

"یہاں دفن ہوئے انھیں بارہ سو سال ہو گئے تھے لیکن مریدوں نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا؛ وہ باقاعدگی سے یہاں حاضری دیتے ہیں جیسے زندہ حکمرانوں اور بادشاہوں کے دربار میں حاضری دی جاتی ہے؛ اس سے انھیں کیا ملتا ہے؟ کوئی تو ایسی قوت ہے یا کچھ تو ایسا حاصل ہے کہ جو انھیں مجبور کیے رکھتا ہے کہ وہ امید اور ناامیدی، ہر دو صورتوں میں

یہاں باقاعدگی کے ساتھ آئیں اور اپنی مرادیں پوری کریں"

ان تین تمہیدی صفحات کے بعد ناول کہانی کی طرف آتا ہے اور دلچسپی کی عمودی اڑان بھرتا ہے اور قاری کو بھی پروں کے ساتھ باندھ کر قریہ بہ قریہ، شہر در شہر مزاروں کی اور مکلی کے چار سو سالہ قدیمی قبرستان کی سیر کرواتا ہے۔ مکلی میں نوابوں کے ساتھ عام لوگوں کی قبریں بھی ہیں جو مٹی کے ساتھ مٹی ہو گئے لیکن دیکھنے والا فرق کر سکتا ہے کہ کہاں نواب دفن ہے اور عام آدمی کی قبر کون سی ہے۔

ناول میں درباروں، مزاروں اور مقبروں کے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات ہیں کہ کون سا صوفی بزرگ یا صوفی شاعر کس شہر، کس علاقے میں دفن ہے؛ یہاں تک کہ ان کے ڈیزائن کس نے بنائے، کب بنے اور ان پر کتنی لاگت آئی اور کیا کیا سیاسی اور مذہبی ہتھکنڈے استعمال ہوئے اور ان پر کس طرح کے عدالتی ردعمل ہوئے۔ اسی لئے پہلی نظر میں یہ ناول، کہانی کے رسیا قاری کو، کچھ ڈاکومینٹری معلوم ہوگا کیونکہ اس میں منظر نگاری، مکالمہ، اور کردار نگاری کم سے کم ہے، اور قاری ناول کو اپنے ٹھوس حقائق اور عدالتی کارروائیوں کے الجھے ہوئے بیانیے کے باعث بھاری بھر کم محسوس کر سکتا ہے۔

ناول میں کئی مزارات کا تذکرہ ہے لیکن اصل قضیہ وارث شاہؒ اور اس بھی بڑھ کر بی بی پاکؒ کے مزار کا ہے جو ناول کے آخر تک چلتا ہے۔ مرکزی کردار چوبیس پچیس سالہ ارسلان منصور ہے جو امریکہ میں پیدا ہوا ہے، آرکیٹیکٹ ہے اور پاکستان آیا ہوا ہے۔ ارسلان شروع ہی سے صوفیانہ شاعری اور گائیکی کا شیدائی ہے لیکن مزارات کی سیاست، رسومات اور عقیدوں سے بالکل بے بہرہ ہے۔ پاکستان میں اس کی ملاقات طارق اسمٰعیل سے ہوتی ہے جو آرکیٹیکٹ ہونے کے علاوہ ذہین صحافی بھی ہے۔ مکلی کانفرنس کی دعوت پر ارسلان اور طارق اسمٰعیل اکٹھے جاتے ہیں۔ مزاروں کے متعلق طارق، ارسلان کو چشم کشا معلومات فراہم کرتا ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ مزارات کے ساتھ عقیدت کی آڑ میں مادی مفادات اور کرپشن کی کیا کیا شکلیں ہیں۔ بی بی پاکؒ کے مزار کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب مقامی سطح پر پتہ چلتا ہے کہ اس کا ڈیزائن مشہد میں موجود امام رضا کے روضے کی شباہت کے مطابق بنایا جا رہا ہے تو اہل سنت والجماعت سخت برہم ہوتے ہیں جو کسی طور نہیں چاہتے کہ مزار کی شناخت کو تبدیل کیا جائے۔ یہ مسئلہ ناول میں طویل

ہے اور اس کے ساتھ صوبائی اور وفاقی حکومتوں اور عدالتوں کی پر پیچ الجھی ہوئی کارروائیوں کا نقشہ بہت موثر انداز میں کھینچا گیا ہے۔
مکلی میں کانفرنس کے دوران ہم زیرو توانائی اور زیرو کاربن کے نظریہ سے بھی واقف ہوتے ہیں جو ہمیں فطرت سے قریب رہنے کے لئے بانس کے گھر بنا کر رہنے کی تجویز پیش کرتا ہے۔ یہ غالباً مابعد جدیدیت کی طرف اشارہ ہے مگر یہاں غافر صاحب کی زیرکی کلام کرتی نظر آتی ہے کہ یہ لوگ بھول گئے ہیں کہ "یہاں سے چند سو کلو میٹر دور کراچی کہ جہاں وہ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے تھے اور پھر جن گاڑیوں سے وہ اس کانفرنس میں پہنچے ہیں، ان ذرائع آمدورفت میں دھویں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا کتنا اخراج کر چکے ہیں جو اوزون کے لیے انتہائی مہلک ہے"۔ پھر یہ کہ "استعمال کیے جانے والے بانسوں کا رنگ جس پینٹ سے سبز کیا گیا تھا، اس پینٹ کی تیاری میں کتنا کیمیکل اور کتنی توانائی استعمال ہوئی تھی اس کی طرف ماہرین میں سے کسی نے بھی توجہ نہیں دلائی تھی"۔
آخر پر ارسلان جو اب تک کلائنٹس کی خواہش پر عمارتیں ڈیزائن کرتا تھا لیکن اب جھگڑوں سے بیزار ہو کر اپنے وجدان کو بروئے کار لاتے ہوئے مزارات کی عمارتوں کے ڈیزائن بنانا چاہتا ہے لہذا وہ عدالت میں چیلنج کے طور پر اعلان کرتا ہے کہ بی بی پاکؒ کے مزار کا وہ ایک ایسا ڈیزائن بنائے گا جو سنی و شیعہ، دونوں فرقوں کو قابل قبول ہو اور یہ ڈیزائن وہ بلا معاوضہ تیار کرے گا۔ بس یہیں ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔
اب عدالت اس کے انتظار میں ہے۔ سنی شیعہ دم سادھے منتظر ہیں۔ ناول کا قاری انتظار میں ہے؛ گویا ایک دنیا اس انتظار میں ہے کہ کب ان فرقہ پرست اور انتہا پسندوں سے جان چھوٹے گی۔ یہ مسئلہ غافر صاحب ہی سلجھا سکتے ہیں کہ وہ خود بھی آرکیٹیکٹ ہیں لیکن وہ ناول میں کہیں نہیں ہیں حالانکہ ارسلان پر غافر صاحب کا شک پڑتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ ناول میں تاریخی، مذہبی، روحانی، علامتی اور اکثر سیاسی حوالے اور اشارے ملتے ہیں۔ غافر شہزاد صاحب خود بھی ماہر آرکیٹیکٹ ہیں اس لیے پورے دروبست کے ساتھ یہ ناول صرف غافر صاحب ہی لکھ سکتے تھے کہ وہی بہتر لکھا جا سکتا ہے جو تجربے میں ہو اور اس لحاظ سے ناول کا موضوع منفرد بھی ہے، جس کے لیے غافر شہزاد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

''کرونا''

سیما پیروز

کرونا کی آمد سے کئی ماہ پہلے سے ہی میں گھٹنے کی سرجری کی وجہ سے گھر میں بند تھی۔ دو تین ماہ تو بستر پر لیٹ کر گزارے۔ اللہ کا شکر ہے وقت جیسے تیسے گزر گیا۔ لیکن کرونا وائرس نے جو گھر میں بند کیا یہ ایک الگ سا ہی تجربہ ہے۔ وقت جیسے ایک جگہ ٹھہر سا گیا ہے۔ زندگی ایک خوف، بے ثباتی اور بے چینی میں گزر رہی ہے۔

وقت اتنا وافر ہے کہ گزری ساری زندگی میں اتنا فالتو وقت کبھی نہیں تھا۔ پھر بھی کسی کام کو دل نہیں چاہتا۔ پڑھنا لکھنا، ٹیلیفون پر باتیں کرنا بھی مفقود ہو گیا ہے۔ بندہ باتیں کرے بھی تو کیا کرے۔ وہی کرونا کی باتیں۔ کتنے بیمار ہوئے کتنے بیچارے جان سے گزر گئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھا ہے۔

اس بندش اور خوف نے آگہی کے دروا کیے تو بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اپنا محاسبہ کیا جو زندگی ہم جی رہے تھے اس پر غور کیا۔

ہم کیا کر رہے تھے۔ بس ایک دائرے میں گول گول گھوم رہے تھے۔ دنیا کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ مال و دولت کے انبار شہرت، آرام و آسائش کے

سامان، ہیرے موتی، محل مینارے۔ ان سب چیزوں کے اندر انسانیت کہیں دفن ہو گئی تھی۔

کیا امیر کیا غریب سب ناآسودہ اور غیر مطمئن تھے۔ توکل کی دولت کہیں کھو گئی تھی۔ دوزخ کی آگ کی طرح ھل من مزید کی صدا ہر طرف سے آ رہی تھی۔ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ آسائشوں کے پیچھے دیوانہ تھا۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے چوری، ڈاکہ، رشوت، ذخیرہ اندوزی، بے ایمانی، دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا اور نہ جانے کیا کیا ہم نے جائز بنا لیا تھا۔ عورتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ فلاں نے پوش سوسائٹی میں گھر بنا لیا ہے۔ ہم بھی بنائیں گے۔ انھوں نے سنگل سٹوری بنایا ہے ہم دو منزلہ بنائیں گے۔ "مسز فلاں نے کھاڈی سے پندرہ ہزار کا سوٹ لیا ہے میں اس سے بھی مہنگا سا شفی ناز کا لوں گی۔"

غریب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ کھانے کو ملے نہ ملے۔ ہاتھ بھر لمبا موبائل خریدنا ہے۔ محلے میں کسی ایک گھر میں موٹر سائیکل آ جائے تو باقیوں کو بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ ادھار لے کر موٹر سائیکل ضرور خریدیں گے۔ چاہے قسطیں اتارتے فاقے کاٹنے پڑیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کرونا کے خوف سے لوگ سدھر جاتے۔ لیکن نہ ہی انھیں اللہ یاد ہے اور نہ موت۔

سبزی والا سبزی موتیوں کے بھاؤ بیچ رہا ہے۔ دودھ میں پانی آٹے میں بھوسی، مرچوں میں اینٹیں، میڈیکل سٹورز دوائیاں دگنے ریٹس پر بیچ رہے ہیں۔ ماسک ہزار میں بک رہا ہے۔ سینیٹائزر ناپید ہے۔ ابھی بھی گوشت کے نام پر کتے اور گدھے کھلا رہے ہیں۔

ان سب باتوں کی بھی تو سزا ملنی تھی۔ جو کرونا کی صورت میں ہمیں مل رہی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں دنیا بھر میں بیچارے لقمۂ اجل بن گئے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے جو کچھ ہو رہا ہے، ہم نے نہ دیکھا نہ سنا ایسا لگتا ہے زندگی تو ہے پر اندر سے روح ختم ہو گئی ہے۔ بیٹھے بیٹھے خیال آتا ہے۔ زندگی کیا اتنی ہی بے ثبات تھی۔ موت تو ہمیشہ سے ہے۔ پر اب تو کرونا سے مرنے کا سوچ کر جھرجھری سی آتی ہے۔ اتنی عبرتناک موت اپنے بھی کفن نہ دے سکیں نہ چہرہ دیکھ سکیں۔ "الٰہی توبہ"

ساری دنیا کا پہیہ جام ہو گیا ہے۔ دنیا بھر کے سائنسدان اور ڈاکٹر انگشت بدنداں ہیں۔

سپر پاورز جو اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگی تھیں۔ سائنس کے بل بوتے پر چاند پر پاؤں لگا آئے۔ اب مریخ پر جائیں گے۔ بھیڑ کی کلوننگ کر لی اب انسانوں کی کلوننگ بھی کریں گے۔ انسانوں کی جگہ پر روبوٹ کام کریں گے۔ انسانوں کے جینے ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

تھرڈ ورلڈ کو یہ لوگ حقیر فقیر سمجھتے تھے۔ ان کی

مرضی کے بغیر جو سانس بھی لے تو جو حال عراق اور لیبیا کا ہوا وہ کسی سے چھپا نہیں۔ ہم جیسوں کو قرضہ بھی ایسے دیتے ہیں، جیسے کتے کے آگے ہڈی ڈالتے ہیں۔

یہ تو غیر تھے اپنے مسلم بھائیوں عربوں نے کیا کیا؟ تیل کی دولت وافر مل گئی تو خدا کو بھلا کر پڑ گئے عیش و عشرت اور عیاشیوں میں۔ (اسی عرب میں میرے نبیؐ نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) انھوں نے غریب مسلم ممالک کی مدد کرنے کے بجائے سونے کے کموڈ اور باتھ روم بنا ڈالے۔

اپنے غرور میں اندھے ہو کر شام اور یمن پر چڑھائی کر دی۔ جب یمن پر اسلامی فوج گولہ باری کر رہی تھی۔ ان کے بچوں کے چیتھڑے اڑ رہے تھے۔ ساری دنیا دیکھ رہی تھی۔ فلسطین کی مائیں بیٹیاں اور معصوم بچے صیہونیوں کی بربریت کا شکار ہو رہے تھے۔ کشمیر کی بیٹیاں اپنی عزتیں لٹا کر جانیں دے رہی تھیں (آج بھی وہ ظلم اور بربریت کا شکار ہیں) دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ان مظالم کا کبھی اور کہیں تو حساب ہونا تھا۔ وہ اوپر نیلی چھتری والا بیٹھا ہے۔ اس کا غضب جوش میں آ گیا ہے۔ مظلوم کی آہ عرش پر جاتی ہے۔

جب بڑے بڑے ملک اپنے سارے سائنس دان اور ساری دولت اکٹھی کر کے لے آئیں اور مقابلہ کریں ایک وائرس کا۔ سب ہار گئے ہیں۔ ہر کوئی اپنے عقیدے کے مطابق خدا کو پکار رہا ہے۔ یہودی دیوار گریہ پر جا کر رو رو کر دعائیں کر رہے تھے۔ عیسائی گرجوں میں عبادت کر رہے تھے۔ دنیا میں جہاں جہاں مساجد ہیں۔ وہاں اذانیں گونج رہی ہیں۔

حضرت محمدؐ نے صدیوں پہلے یہ فرما دیا تھا۔ کہ کسی گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں۔ صرف تقویٰ کی بنیاد پر فضیلت ہے۔

سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ ساری دنیا یہ سبق بھلا بیٹھی تھی۔ میرے رب نے انسان کو بھولا ہوا سبق یاد کروایا ہے۔

''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

.....

آخر میں یہی عرض کروں گی کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگیں۔ ایک دوسرے کی دلجوئی کریں۔ غریبوں کی مدد کریں۔ انھیں راشن پہنچائیں۔ بیمار ہوں تو ادویات فراہم کریں۔

اللہ تعالیٰ ہماری خطائیں معاف فرمائے۔ وہ بڑا رحیم اور کریم ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد آفت ختم ہو جائے گی۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر جاوید انور کی نظم نگاری

محمد نوید مرزا

ڈاکٹر جاوید انور کا نام اردو شعر و ادب خصوصاً جدید نظم کے حوالے سے دنیائے ادب میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اردو ادب کو شہر میں شام، اشکوں میں دھنک، بھیڑیے سوئے نہیں اور برزخ کے پھول کے نام سے شعری مجموعے دینے والے اس نامور اور خوبصورت شاعر کی جواں عمری میں اچانک موت نے اس کے اہل خانہ، دوستوں اور چاہنے والوں کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دھاڑیں مارتے ہوئے روتے دیکھا ہے۔ جاوید انور ایک اچھے شاعر ہی نہیں خوبصورت انسان بھی تھے، گو کہ میرا ان سے دوستانہ تعلق تو نہ تھا لیکن بحیثیت شاعر اور ادیب میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی میں نے انھیں عاجزی اور محبت کا پیکر ہی پایا۔

جاوید انور کا پہلا شعری مجموعہ ''شہر میں شام'' کے نام سے 1991 میں منظرِ عام پر آیا اس مجموعے میں انھوں نے نظم کے ساتھ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان دونوں اصناف میں ہی وہ ایک منفرد اور خوبصورت لہجے کا شاعر دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ خود کو نظم ہی کا شاعر کہنے میں فخر

محسوس کرتے ہیں۔ شہر شام میں وہ خود لکھتے ہیں،''میں زندگی کو نظم کرنے کا قائل ہوں۔ زندگی جوایک ڈرامائی آہنگ ہے اور ڈرامائی آہنگ جو آپ کو کارخانۂ حیات کے ہر نظام میں نظر آئے گا۔ خوردبین اور دوربین گواہ ہیں لیکن آہنگ اور ڈرامہ کا جغرافیہ اپنا''اپنا ہے جس کا پھیلاؤ،''لا'' تک ہے جو آپ تخلیق کے عمل میں ہیں تو آپ ان دونوں میں ایک نئی تنظیم ڈھونڈ رہے ہیں جس کے بلیو پرنٹ پہلے ہی آپ کے اندر یا باہر موجود ہیں۔ مجھے یہ آہنگ اور یہ ڈرامہ جو میری شاعری ہے اسی زندگی کے ڈسٹ بن سے ملے ہیں جو گزار رہا ہوں - ان گلیوں، سڑکوں، ہسپتالوں، سکولوں، کتابوں، اخباروں اور بظاہر اور بعض انتہائی معمولی چیزوں سے میری نظموں نے مجھے پکارا اور میں نے انھیں کاغذ پر رکھ دیا۔ کسی بڑے بناؤ سنگھار کے بغیر کہ لفظ میرے لیے کھولنے نہیں اور زندگی بھر ان لفظوں کو لکڑی، لوہا یا پتھر سمجھ کر آری اور ہتھوڑے نہیں چلا سکا، نظم نہیں بنا سکا۔

یوں نظموں کے درمیان زندگی گزارنے والا یہ نظم گو شاعر جاوید انور زندگی کے ڈسٹ بن سے صاف ستھری نظمیں تخلیق کر کے بھی کسی بڑے دعوے کا قائل نظر نہیں آتا مگر اس کی نظم میں بے پناہ وسعت ہے۔

جاوید انور کا دوسرا مجموعہ ''اشکوں میں دھنک'' 1994 میں شائع ہوا اس مجموعے کی شاعری بھی اپنے اندر انفرادیت اور خوبصورت آہنگ رکھتی تھی۔ شاعری میں نئے زاویے شروع سے ہی ان کا خاصا رہے ہیں لہٰذا اس مجموعے میں بھی ان کے نت نئے شعری انداز جا بجا نظر آتے ہیں۔

''بھیڑیے سوئے نہیں'' جاوید انور کا تیسرا شعری مجموعہ ہے اس مجموعے کی شاعری پہلے دونوں مجموعوں سے آگے کی شاعری ہے جاوید انور کی شاعری کا کینوس بہت وسیع تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کے وہ ایک کثیر المطالعہ شخص تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بہت زیادہ حصہ میں آسٹریا میں گزارا تھا۔ ان کی نظم میں وہاں کے ماحول کی عکاسی بھی تھی اور پاکستانی معاشرے کا عکس بھی نمایاں تھا۔ یوں وہ مغربی شاعری کو اپنے اندر رواں دواں رکھتے تھے اور پاکستانی شعرا سے بھی متاثر تھے ان کے ہاں اپنے عہد کے آشوب کی تصویر کشی بھی نمایاں ملتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف ''بھیڑیے سوئے نہیں'' کے فلیپ میں کتاب کے ناشر ادارۂ قوسین کی طرف سے چند سطریں اس جانب یوں اشارہ کرتی ہیں،''جاوید انور کی شاعری میں بیسویں صدی کے آخری اور اکیسویں صدی کے آشوب کی جو تصویر نظر

آتی ہے وہ لرزہ طاری کرتی ہے۔ لیکن اس کے شعری مزاج میں ایک استقامت ہے جو اسے ظالموں، بھیڑیوں اور انتشار سے فکر لینے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مغربی شاعری کے جوہر کو اپنے اندر جذب کیا ہے اور اردو شاعری، بالخصوص مجید امجد کے بعض پہلوؤں کو خوب سمجھا ہے۔''

اس مجموعے کی بہت سی نظموں کے عنوانات ہی چونکا دینے والے ہیں۔ مثال کے طور پر ''جواب ہی سوال ہے''، ''سمندر مرے بار باتوں میں سویا ہوا ہے''، ''شام ہوئی بن شام محمد''، ''رات کی حمد''، ''نابینا بستی میں سورج'' اور ''لاعلمی کی طاقت'' وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر جاوید انور کا چوتھا مجموعہ کلام ''برزخ کے پھول'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا جسے انھوں نے اپنی زندگی میں ہی مرتب کیا تھا اس مجموعے میں بھی زیادہ تر شاعری کی نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کا نام، جس نظم کے اخذ کیا گیا ہے اسے شاعر نے ''برزخ کے پھول'' شیز وخرسینیا کا نام دیا ہے اس طویل نظم میں سطر در سطر کئی معنوی پرتیں چھپی ہوئی ہیں جسے کھولنے کے لیے ذہن کے بہت سے مقفل در بھی کھولنے پڑتے ہیں اور ایک جست بھی لگانا پڑی ہے۔ نظم کا آغاز دیکھیں۔

ایک ہاتھ کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں___ شکل تو بھول چکی ہے___ نام یاد ہے___ علم دین تھا___ علم دین کے چاروں جانب علم دین ہی علم دین تھا___ خط لکھتا رہتا تھا___ علم دین کے خط میں___ پتہ پتہ ___اور خزاں ہے!

اس مجموعے میں شاعری کی کچھ ترجمہ نظمیں بھی شامل ہیں جب کہ آزاد نظموں کے علاوہ چند نثری نظمیں اور غزلیں بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ جاوید انور کی شاعری میں اکثر مسائل کی نشاندہی اور مشکل حالات پر نوحہ گری ملتی ہے کہیں واضح اور کہیں ڈھکے چھپے انداز میں وہ اپنی بات کی کڑواہٹ بھرپور تخلیقی انداز میں کہہ جاتے ہیں ''برزخ کے پھول'' کے علاوہ وہ ایک کتاب ''قہقہہ انسان نے ایجاد کیا'' میں مہمان شاعری کی حیثیت سے بھی شریک ہوئے اور دراصل یہ کتاب تین شاعروں کی مشترکہ کاوش تھی جسے بہت پسند کیا گیا۔

اب آیئے ذرا ڈاکٹر جاوید انور کے حالات زندگی کا بھی جائزہ لے لیں۔ جاوید انور 21 اپریل 1959 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ یوں وہ برج ثور سے تعلق رکھتے تھے۔ برج ثور کے حامل افراد انتہائی ذہین اور حساس ہوتے ہیں انھوں نے اپنا بچپن

تونسہ برج میں گزارا اور پرائمری تعلیم شاہین آباد، سکھان والی سرگودھا میں حاصل کی۔ انھوں نے میٹرک گورنمنٹ کمپری ہینسو ہائی سکول سرگودھا اور ایف ایس سی گورنمنٹ کالج سرگودھا سے پاس کیا جب کہ ایم بی بی ایس کی ڈگری فیصل آباد میڈیکل کالج سے حاصل کی۔ انھوں نے ہاؤس جاب جنرل ہسپتال لاہور کے شروع کی اس کے علاوہ وہ پنجاب کے دیہی علاقوں ایوان دہی والا اور گند جو بارا اوکاڑہ میں بھی ملازمتی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1989 میں ان کی شادی ہوئی اور وہ اپنی آسٹرین نژاد بیوی کے ساتھ آسٹریا چلے گئے۔ جہاں سے وہ گاہے بگاہے پاکستان آتے رہے۔ ایسے ہی ایک ملکی دورے پر جب وہ پاکستان آئے ہوئے تھے تو اچانک انھیں دل کا دورہ پڑا اور وہ 25 نومبر 2011 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر جاوید نے اردو شاعری خصوصاً نظم کی صنف میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور اردو میں ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آخر میں "برزخ کے پھول" میں ان کے بارے میں درج چند سطریں پڑھیں اور مجھے اجازت دیں۔ جاوید انور نے ان نظموں اور غزلوں میں برزخ کے جو پھول کھلائے ہیں وہ دور نگے ہیں۔ ان میں جنت کے رنگ اور سکھ بھی ہیں اور دوزخ کی جھلک اور دکھ بھی ہے، جس میں ہم اپنے احساسات کو توڑتے جوڑتے رہتے ہیں اور وہ دنیا بھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی ہماری دخل اندازی سے باہر ہے۔ یہ برزخ کہیں اور نہیں ہمی میں ہے جہاں گل چینی کا حوصلہ کسی کھرے شاعر میں ہو سکتا ہے۔

اللہ پاک اس کھرے اور بے مثال شاعر کی مغفرت فرمائیں۔ (آمین)

آخر میں نظموں کے اس جادو بیان شاعر کی غزل کے چند شعر ملاحظہ کریں:

تم دیوار بنو اور ہم در بن جائیں
آؤ دونوں مل کے اک گھر بن جائیں

تیری خاطر مرے گرم خطے کی ٹھنڈی ہوا
سب ہری ٹہنیاں اور ان پر کھلے پھول تیرے لیے

تیرے رستے کی رکاوٹ شاخ اک زیتون کی
تیرے دیوانوں کے اندر جاگتا ڈر فاختہ

رچی ہوئی ہیں فضا میں اداسیاں کب سے
پڑی ہیں لان میں دو خالی کرسیاں کب سے

پانی پہ تیرتی رہیں بچوں کی تختیاں
ان پہ لکھے بزرگوں کے اقوال بہہ گئے

☆☆☆☆☆

اکرام الحق کی سرشار میں ڈوبی شاعری اور ''صبح ہونے دو''

انعام الحسن کاشمیری

اکرام الحق سرشار سے صوتی و ریڈیائی لہروں پر مبنی تعلق زیادہ پرانا نہیں لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ربط برس ہا برس کی شناسائی پر محیط ہے۔ یہ محض روایتی جملہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد اُس شفقت، محبت، الفت، ملنساری، عجز وانکساری پر ہے جو جناب اکرام الحق سرشار کی ذات کا حصہ ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود اگر وہ اپنی مونچھوں کے سفید بالوں پر خضاب لگالیں تو یقین جانیے یہی دکھائی دے گا کہ وہ تیس چالیس کے پیٹے میں ہیں یا شاید اس سے بھی کم۔ ان کے جسم کا ڈیل ڈول البتہ زائد عمر کی چغلی کھاتا ہے۔

جناب اکرام الحق سرشار کی شاعری کا آغاز بھی سکہ بند شعراء کی طرح عین لڑکپن میں ہی ہوا ہے اور انھوں نے شعور کی چشم بینا کے کھلتے ہی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ابتدا میں ان کی مشق مختلف اصناف ادب کے دائروں میں گھومتی پھرتی رہی لیکن پھر آخرکار انھوں نے جان لیا کہ شعر گوئی ہی ان کی اصل راہ اور منزل ہے اور پھر یہیں سے انھوں نے جس انداز میں رنگ تغزل کو اپنے دل و دماغ اور اپنے خیالات و افکار میں سمویا، اس نے آگے چل کر بادِ نسیم کے موافق ان کی تخلیق سے پھوٹتی خوشبوؤں کو چہار سو اطراف میں بکھیر کر چیچہ وطنی کی فضا کو پُر کیف بنا ڈالا۔

یہ امر خاصا حیران کن اور باعث تحقیق طلب ہے کہ 1951 کے آخیر میں جنم لینے والے جناب سرشار کا اولین شعری مجموعہ ''غنچہ سحر'' ٹھیک 18 برس کی عمر میں 1969ء میں شائع ہوتا ہے۔ ''صبح ہونے دو'' کے پیش لفظ میں وہ از خود رقم طراز ہیں کہ میں نے 1968ء میں شعری دنیا میں قدم رکھا اور پہلی غزل ''آفتاب حکمت'' میں شائع ہوئی۔ اس سے اگلے برس یعنی 1969ء میں انھوں نے چیچہ وطنی میں بزم فروغ ادب کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ سن تھا جب ان کا پہلا شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوا جس میں ان کے استاد گرامی چوہدری کرم الٰہی عامل کا تبصرہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اس نوجوان شاعر کی نہ صرف بھرپور الفاظ میں حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ان کی شاعری کو شاندار قرار دیا ہے بلکہ پیشین گوئی بھی فرمائی ہے کہ یہ نوجوان آنے والے وقت میں آسمان

ادب پر ایک چمکتا دمکتا ستارہ بن کر طلوع ہوگا۔ استادِ محترم نے ایک اور پیشین گوئی بھی فرمائی کہ سرشار کا اگلا مجموعہ یقیناً زیادہ نمایاں اور کامیاب ثابت ہوگا۔ استاد کی یہ پیشین گوئی یقیناً کامیاب ہوئی اور سرشار کا اگلا اور دوسرا مجموعہ اس قدر پذیرائی کا حامل ٹھہرا کہ اسے باقاعدہ ایم فل کے مقالہ کے لیے منتخب کرلیا گیا لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ استاد کی یہ پیشین گوئی پوری نصف صدی کے بعد 2021ء میں ''صبح ہونے دو'' کے عنوان سے پوری ہوئی۔

نصف صدی کا یہ بیچ کا عرصہ سرشار نے کس کیفیت میں گزارا کہ ان کی طبیعت دوسرے مجموعہ کی اشاعت پر راغب کیوں نہ ہوسکی اور انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو مسلسل جاری رکھنے کے باوجود وہ سنگ ہائے میل عبور کرنا کیوں ناضروری سمجھا جنھیں کچھ عرصہ کے دوران مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنا اہم ترین خیال کیا جاتا ہے اور اس کے بغیر شاعر کی تخلیقات اس کی ذاتی تسکین کا باعث تو بن سکتی ہیں لیکن اس کے حلقہ عقیدت مندان کی تشنگی کو مٹانے میں کافی ثابت نہیں ہوسکتی۔ یہ عرصہ دس سال تک تو گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے زائد نہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نصف صدی کے درمیانی عرصہ میں سرشار کی طبیعت موزونیت کی جانب مائل نہ تھی اور وہ اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لانے میں تغافل کا مظاہر فرماتے رہے۔ اس عرصہ میں بھی سرشار مسلسل اپنے دائرہ فکر و عمل میں پوری یکسوئی اور ارتکاز خیالات کے ساتھ سرگرم رہے اور انھوں نے مضافات میں رہنے کے باوجود جس طرح ادبی دنیا کے قلب کے ساتھ اپنے رشتہ و تعلق کو استوار رکھا، اس کے لیے انھیں خوب داد دینا پڑے گی۔ ان کے لیے ایک اور داد یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے استادِ محترم کی پیشین گوئی کو نہ صرف پوری طرح مکمل کیا بلکہ اس میں مزید اس طرح اضافہ فرمایا کہ ایک اور شعری مجموعہ کی اشاعت ہی نے سرشار کو ستارہ سے ایک روشن ماہتاب کے مقام پر فائز کر ڈالا۔

سرشار کی شاعری مختلف النوع جہت پر مبنی ہے۔ ان کے خیالات کی نفاست، وسعت اور اثر پذیری اس قدر گہری اور عمیق ہے کہ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شخص نے درحقیقت ماں کی گود میں آنے کے بعد اپنے لبوں سے وا ہونے والے پہلے الفاظ ''غوں غاں'' کو بھی تغزلی انداز میں ادا کیا ہوگا۔ ایک لڑکا عموماً اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ شعری مجموعہ ترتیب دے ڈالے اور اگر کسی صورت ایسا ممکن بھی ہوجائے تو کسی استاد شاعر کی اس بارے میں ایسی عمدہ اور حیران کن رائے اس پر

ثبت ہونا کار مشکل ہے لیکن سرشار کو یہ اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔

''صبح ہونے دو'' اگرچہ از خود سرشار کی رائے میں یہ عنوان خوب ہے لیکن سرشار نے اس کی اشاعت سے دراصل نصف صدی کی شب طویل کو سحر میں بدل ڈالا ہے جو دوسرے شعری مجموعہ کی اشاعت کے حوالے سے طویل ہوتے ہوتے شب اماوس میں بدلنے والی تھی۔ اس لحاظ سے شب بر محیط نصف صدی کے سائے چھٹ چکے ہیں اور صبح طلوع ہو چکی ہے۔ اس کے طلوع ہونے کا انداز بھی ایسا ہے کہ کوہساروں پر جب آفتاب کی کرنیں دھیرے دھیرے نیچے وادیوں کی جانب سرکتی ہیں تو دیکھنے والوں کے لیے یہ منظر بڑا جانفزا ہوتا ہے۔ اس کا سحر اس قدر پر اثر ہوتا ہے کہ زندگی یہیں ٹھہرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کرنیں دھیرے دھیرے آخر کار کوہساروں کے دامن میں روشنیوں کے الاؤ بھڑکا کر ہر شے کو بقعہ نور بنا ڈالتی ہیں۔ سرشار کی ''صبح ہونے دو'' اگرچہ کوہساروں کی بلندیوں پر ناچتی یہ کرنیں ہیں لیکن انھوں نے دھیرے دھیرے نیچے وادیوں کا رخ کرنے کے بجائے ایک جست ہی میں سارا فاصلہ طے کیا ہے اور قوانین فطرت کے منافی پربتوں اور وادیوں کو ایک لحظہ ہی میں بقعہ نور بنا ڈالا ہے۔ اس نور کے آگے ہر چیز خیرہ دکھائی دے رہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہ ''صبح ہونے دو'' کا آفتاب ان پہاڑوں پر طلوع ہوا ہے جہاں انسانی زندگی کے ہمہ ہمی اس طرح موجود نہیں جس طرح کہ ادب کے بڑے مراکز کے حامل شہروں جیسے کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں اس زندگی کی رنگینیاں اور آفرینیاں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صبح دم مشرق میں پھیلتی قرمزی روشنیوں نے ابھی بہت کم آنکھوں کو خیرہ کیا ہے اور ابھی بہت کم چہرے ان کی روشنیوں سے ضیا بار ہوئے ہیں اور ابھی بہت کم مقامات سے رات کے سیاہ بادل چھٹ سکے ہیں۔

''صبح ہونے دو'' درحقیقت وہ مضراب ہے جس کی کوکھ سے ترنم اور نغمگی کی ایسی لے بلند ہوتی ہے جو براہ راست قلب پر اثر انداز ہوتی ہے اور پھر قاری اور سامع کو اپنی گرفت میں ہمہ وقت لیے بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے سحر کا شکار ہونے والے کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ لطف و حظ کی کن بلندیوں پر محو پرواز ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر ایک رائے دھیرے دھیرے پھیلتی چلی جا رہی تھی کہ اب فن شعر گوئی کا سفر تمام ہوا اور اب کوئی بشر ایسا نہیں جو استادانہ رنگ میں شعر کہہ سکے لیکن

جناب اکرام الحق سرشار نے درحقیقت اس رائے کو نہ صرف مسترد کر دیا ہے بلکہ ثابت بھی کر دیا ہے کہ جس طرح بہار کی رنگ آفرینیاں اپنے وجود سے قلب و جگر کو مسحور کر رہی ہیں اور یہ سلسلہ ابد تک چلتا رہے گا اسی طرح گلشنِ تغزل کی آبیاری اور اس کے غنچوں کی مہک سے جہان کو معطر کرنے والے تخلیق کار بھی اپنے وقت پر آتے رہیں گے اور ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنانے کے ہنر بے مثل کا جادو دکھاتے رہیں گے۔ جناب اکرام الحق سرشار بھی ایسے ہی فنکار اور ہنرکار ہیں۔

دشتِ شب پر خون چھڑکا جائے گا
تب کہیں جا کر اندھیرا جائے گا

.....

کبھی اختتام پذیر ہوتی شب اور طلوع ہوتی صبح کا نظارہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جب شب کی تاریکیاں اپنی کمین گاہوں کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہیں تو آسمان کے کناروں پر شفق کی سرخیاں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے کسی نے زمین کے اطراف میں کچھ اوپر کر کے خون کی پھوار پھینکی ہے جس کے چھینٹے آسمان پر بھی جا پڑے ہیں۔ ایسا شعر صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا مشاہدہ عمیق ہو اور جس کے خیالات نہایت ارفع۔ ''صبح ہونے دو'' میں ایسی مثالیں کثرت سے بکھری پڑی ہیں۔

اور جب سرشار یہ کہتے ہیں کہ:-

صبح ہونے دو کرن کے ساز پر
نغمۂ سرشار چھیڑا جائے گا

.....

تو درحقیقت سرشار اپنی صلاحیت کے اظہار کو پوری خود اعتمادی اور یقین محکم کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس کی بابت ان کے استاد نے ''غنچۂ سحر'' پر اپنی رائے رقم طراز کی تھی۔ اس حوالے سے جناب سرشار کا اعتماد لائق تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعہ کی اشاعت سے قبل ہی کہہ دیا کہ ''صبح ہونے دو'' کی کوکھ سے جو نغمہ جانفزا جنم لے گا، وہی محفل میں پھر آخر دم تک چلے گا۔ ساز اور گویے آتے اور جاتے رہیں گے، حاضرین اور ناظرین اپنے پہلو بدلتے رہیں گے اور ان کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہے گی لیکن ہوا کے دوش پر جس نغمے کے بول تھرتھراتے رہیں گے وہ سرشار کا ہی ہوگا اور یہ سرشاری کا کمال ہوگا جو ہر شخص کو ایک ایسی سرشاری میں مبتلا رکھے گا کہ جس کے بعد کوئی اپنی کیفیت میں تبدیلی کی خواہش ہرگز نہ کرے گا کیونکہ اس سرشارانہ کیفیت میں جو حظ اور لطف، جو آہنگ اور جو لطیف احساس ہم میں جنم پذیر ہوگا، اس سے زندگی کے رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے پھیل جائیں گے تب ہم زندگی کی اصل حلاوت اور طراوت کو محسوس کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

☆☆☆☆

''محبتوں کا پیامبر: ڈاکٹر آصف شفیق''

عہدِ حاضر کے معاشرتی رویوں کا اگر عمیق نظری سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آج ہم بغض، کینہ، حسد، منافقت اور خود پرستی کے حبس زدہ ماحول میں سانس لے رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ماحول ہمارا اپنا پیدا کردا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی و معاشرتی اقدار، خلوص، وفا، اپنائیت، ایثار، قربانی اور احساس جیسے کومل جذبوں سے تہی داماں ہوتے جا رہے ہیں۔ دوڑتی بھاگتی ہوئی زندگی میں ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے چکر میں دانستہ اور غیر دانستہ طور پر جانے کتنے رشتوں کو پاؤں تلے کچل رہا ہے۔ خواہشات کی اس میراتھن ریس میں دوڑنے والوں کی اکثریت اپنی منزل کے تعین سے بھی بے خبر ہے یوں کہئے کہ دیکھا دیکھی میں سب بھاگ رہے ہیں۔ کئی جوش میں اور کئی خوف میں---ایسے میں اگر کہیں دم بھر کے لیے بھی قدم رکتے ہیں تو حبس زدہ ماحول سانسوں کے تسلسل میں بگاڑ پیدا کرنے لگتا ہے لیکن اگر کسی جانب سے مہر و وفا سے لبریز ہوا کا تازہ جھونکا میسر آ جائے تو دم توڑتی ہوئی انسانی اقدار کے چہرے پر زندگی کی رمق رقص کرنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر شفیق آصف، خلوص، وفا اور محبت کا ایسا ہی کومل جھونکا ہے جو انسانیت کے زرد پڑتے ہوئے چہرے پر حیاتِ جاوداں کے رنگ بکھیرنے میں محو ہے۔ ڈاکٹر شفیق آصف سے میری پہلی ملاقات 2005 میں بزم فکر و خیال سرگودھا کے اجلاس میں ہوئی میرا وہ پہلا مشاعرہ تھا اور انہیں دنوں وہ معاش کے سلسلہ میں ملتان سے ہجرت کر کے ریڈیو پاکستان سرگودھا میں بحیثیت کمپیئر اور ڈیوٹی آفیسر آئے تھے۔ انہیں بھی نئی جائے پناہ میں ہم مزاج لوگوں کی ضرورت تھی اور میری بھی ریگزارِ ادب میں نئی نئی پیش قدمی تھی۔ یوں بزم فکر و خیال، ریڈیو پاکستان سرگودھا اور الحیات ہوٹل خیام چوک سرگودھا کی ادبی بیٹھک میں ہماری تسلسل سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہم ایک دوسرے کے مزاج دم داں

ارشد محمود ارشد

بنتے گئے۔ پھر 2006 میں جب انہوں نے اپنی فیملی کو ملتان سے سرگودھا منتقل کیا تو ہمیں کچھ عرصہ کے لیے ہمسائیگی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ یوں ہمارا تعلق مزید گہرا ہوتا گیا۔ اور اس طرح پندرہ سولہ سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اس عرصہ کے دوران میں نے ڈاکٹر شفیق آصف کی زندگی کے رنگ بدلتے دیکھے ہیں وہ ملتان سے آئے تو ریڈیو پاکستان سرگودھا کے ساتھ منسلک ہوئے پھر یونیورسٹی آف سرگودھا میں ایچ ای سی کے ایک ریسرچ پروجیکٹ میں بطور ریسرچ اسسٹنٹ شامل ہوئے۔ اپنی ہمت حوصلے اور عزم مسلسل کی بدولت بہت سے تعلیمی معرکے سر کیے۔ ایم اے (اردو)، ایم اے (پنجابی) ایم فل، پی ایچ ڈی، ڈی ایچ ایم ایس اور فاضل طب و جراحت کرنے کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسسٹنٹ سے گریڈ انیس میں اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف میانوالی، ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ اور پھر انچارج ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینٹیز کے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالنا جوئے شیر لانے سے کم تو نہیں ہے اس دورانیے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ معاشی، معاشرتی، طرزِ رہائش، طرزِ زیبائش اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ ڈاکٹر شفیق آصف کی فطری شفقت، محبت اور خلوص ہے اس کا آج بھی اپنے دوستوں سے وہی بے تکلفانہ رویہ ہے جو آج سے پہلے تھا اور وہ اسی طرح خلوص، محبت اور وفا کا پیامبر ہے۔ میری اس بات کی تصدیق، حلقۂ یاران شفیق کا ہر فرد کرے گا۔

اگر ڈاکٹر شفیق آصف کی شاعری کی بات کی جائے تو اُس میں بھی اُن کی ذات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ وہ محبت کے تیشے سے نفرت کے کوہِ گراں کو پاش پاش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ اور ہمہ وقت نفرت، حسد، کینہ و بغض کی فسوں کاری کا خاتمہ چاہتے ہیں اور اس پرفتن دور میں وہ پیار، امن اور محبت کی شجرکاری کے تمنائی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھئے۔۔ تیری سوچوں پہ تو نفرت کا فسوں طاری ہے میرا شیوہ تو محبت کی شجرکاری ہے

اب موت یقینی ہے اس جبرِ مسلسل کی وہ اُس کا زمانہ تھا، یہ میرا زمانہ ہے جذبوں کے چراغوں کو ہم اپنا لہو دیں گے اس دور کی ظلمت کو ہر طور مٹانا ہے

شفیق آصف جب اپنے اردگرد ظلم، جبر اور نفرت کے اندھیروں کو بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بے چین ہو کر اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں۔

تاریکیوں کا حبس ہے میرے وجود میں
جذبوں کی روشنی سے میرا دل اجال دے

روشن رہیں چراغ محبت کے عمر بھر
کچھ ایسا ذوق دید کو عکسِ جمال دے

ڈاکٹر شفیق آصف افراتفری، نفسانفسی اور خود پرستی کے اس ماحول کو دیکھ کر فکرمند ضرور ہوتے ہیں لیکن مایوسی کو خود پر طاری نہیں

ہونے دیتے بلکہ وہ امید اور آس کا در ہمیشہ وا رکھتے ہیں انہیں پورا یقین ہے کہ جس کی حکمرانی سدا نہیں رہتی موسم ضرور بدلتا ہے اور بہار کو آنے سے خزائیں کسی صورت بھی نہیں روک سکتیں وہ کہتے ہیں--

فضا پر حکمرانی ہے ابھی تک جس کی آصف
یقیناً رُت بدلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

سحر کے لوٹ آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
ستارہ آخرِ شب کا دمکتا ہے نگاہوں میں

....

اور جب موسم کروٹ بدلنے لگتا ہے، خزاں رسیدہ ٹہنیوں پر نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں محبتوں کے پھول مہکنے لگتے ہیں اور ظلم کی سیاہ رات کا طلسم ٹوٹنے لگتا ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں:

کچھ شب کی سیاہی میں کمی آنے لگی ہے
کچھ دن کے اجالے بھی نمودار ہوئے ہیں

....

یوں تو انسان خود کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے لیکن اکثر اوقات اپنی انا کی تسکین اور خود پرستی کی لذت کے لیے حیوانات سے بھی کم تر سطح پر آجاتا ہے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر لوگوں کی اجتماعی زندگیوں کو بھی اجیرن کیے رکھتا ہے اور اس کا یہی رویہ انسانیت کی تذلیل کا باعث بنتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر شفیق آصف کہتے ہیں:

اک کھلونے کی طرح انسانیت کا ہے وجود
شاہراہِ زندگی پر ٹوٹ کر بکھرا ہوا

جانے کیوں اس دور کا ہر آدمی
محو ہے انسان کی تذلیل میں

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں یا رب
تری خدائی میں کیا دور انتشار آیا

....

آج کا انسان خود کو جتنا مرضی مہذب، ترقی یافتہ اور روشن خیال تصور کر لے مگر حقیقت یہی ہے کہ اُس کے سب دعوے جھوٹے اور کھوکھلے ہیں۔ انسان انسانیت کی تذلیل اور تباہی کا خود ذمہ دار ہے شفیق آصف جیسا نرم خو شاعر جب انسان کی انسان کے ہاتھوں تذلیل دیکھتا ہے تو تڑپ کر کہنے لگتا ہے--

آدمی اپنی تباہی کی طرف ہے گامزن
ہم چلے تھے کس طرف لیکن کہاں تک آ گئے

....

اس کے باوجود بھی ڈاکٹر شفیق آصف اُمید وبیم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا کیونکہ جہدِ مسلسل اور سفر اُس کے خمیر میں شامل ہے اور وہ اسی کے بل بوتے پر وقت کا دھارا بدلنے کا تمنائی ہے۔

کاٹ دے تیغِ ستم کو پھر رگِ جاں سے شفیق
جبر کے زندان سے انسان کی حرمت نکال

....

انسان کی ازل سے یہی خواہش رہی ہے کہ کوئی اُس کا ہم خیال، ہم مزاج ہو، ہم زبان ہو جو اُس کے درد بانٹے جو اُس کا کرب سمجھے جس پر وہ اپنے دل کے درد وا کر

سکے۔ لیکن خود پرستی کے اس دور میں کوئی ہم مزاج و غمگسار مقدر والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے تو ایسے میں خود کلامی ہی تسکین دل و جاں ٹھہرتی ہے:

خود ہی رو کر گیت سنانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو ہم دیوانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو کرتے ہیں ہم قتل یہاں
خود ہی اپنا سوگ منانے لگتے ہیں

.....

خود کلامی اور خود آشنائی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن کا باہمی فاصلہ کم ہونے لگتا ہے اور جو انسان خود شناسی کی معراج پا لیتا ہے اسے زمانہ شناس ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

انسان کے ذاتی دکھوں میں ہجرت بھی ایک اذیت ناک دکھ ہے۔ فی زمانہ معاشی و معاشرتی مجبوریاں انسان کو اس کرب ناک صورت حال سے گزارتی ہیں کہ اسے اپنا گھر بار، دوست احباب، رشتے ناتے چھوڑ کر دور دیس جانا پڑتا ہے نئے ماحول سے آشنا ہونے میں بھی کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے بادل نخواستہ وہ خود کو نئے ماحول میں ڈھال بھی لے تو اس کو اپنے دیس کی یاد ضرور ستاتی رہتی ہے ڈاکٹر شفیق آصف نے بھی ہجرت کے کرب کو سہا ہے وہ اسے اپنے اشعار میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

دشت کی جانب ہم کو نکلے ایک زمانہ بیت گیا
اپنے شہر کے منظر دیکھے ایک زمانہ بیت گیا

کتنے پنچھی تھے کہ جو مجبور ہجرت ہو گئے
اور مشیت کے سہارے آشیاں رہنے دیا

پھرتے رہے ہیں خانہ بدوشی میں عمر بھر
دشتِ سفر میں ہم سا کوئی بے اماں نہ ہو

.....

ڈاکٹر شفیق آصف کی شاعری میں عام آدمی کا دکھ بولتا ہے اُسی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ آج کا انسان خود کو تنہائی کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ محفل میں رہ کر بھی تنہا ہوتا ہے تنہائی کا یہ عفریت جب جبڑے کھولے اس کی طرف بڑھتا ہے تو اس وقت یادیں ہی اُس کا واحد سہارا ہوتی ہیں۔ جو اُسے ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ اور تنہائی کے وار سہنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر شفیق آصف کہتے ہیں:

کیا ستائے گی کڑکتی دھوپ آصف روح کو
یاد کے بادل نے سر پہ سائباں رہنے دیا

ہم ملے تھے شفیق آصف سے
تیری یادوں میں شعر کہتا ہے

.....

شفیق آصف کی شاعری بلاشبہ ٹھنڈے میٹھے چشمے کی مانند اپنے قاری کے دل کی تشنہ زمین کو سیراب کرتی ہے اور اس کے من آنگن میں نئے موسموں کی بہار لانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے ڈاکٹر شفیق

آصف اپنے قاری کو مایوس نہیں ہونے دیتا
بلکہ وہ اُسے عزم و حوصلہ مندی کا درس دیتا
ہے اور اسے دلاسہ دیتا رہتا ہے کہ موسم سدا
ایک سا نہیں رہتا امید کا دامن تھامے رہو۔
ابھی موسم کے ہاتھوں نے ہوا کے پر نہیں کھولے
کہ بوئے گل بکھرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

.....

ڈاکٹر شفیق آصف بیدار مغز اور بینا چشم انسان
ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے آنکھیں
نہیں چراتا۔ بلکہ اس کی نگاہ دور بین ہمیشہ
حالات کی رفتار پر رہتی ہے وہ معاشرے کے
دکھ سکھ، غمی خوشی، آس، یاس، اور کرب و اذیت
کا انتہائی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور
پھر اُسے اپنے جذبوں اور لفظوں کا پیرہن عطا
کر کے شعری فن پارے میں ڈھال دیتا ہے:
آصف مرے افکار علامت ہیں سحر کی
شعروں میں مرے عصرِ رواں جاگ رہا ہے

اک فکرِ درخشاں میں جہاں جاگ رہا ہے
آصف مرا احساسِ جواں جاگ رہا ہے
جذبے ہیں مرے آج بھی اس بات کے شاہد
آنکھوں میں کوئی خواب گماں جاگ رہا ہے

.....

ڈاکٹر شفیق آصف کی شاعری میں حریت کا
درس بھی ملتا ہے۔ حریت کا بہترین استعارہ
صبر و قناعت کی معراج اور روشنی کا مرکز و منبر
بلاشبہ واقعہ کربلا ہے۔ فی زمانہ جب بھی حق و
باطل کا سامنا ہوا ہے حریت پسندوں نے
کربلا سے ہی طاقت کشید کی ہے۔
ڈاکٹر شفیق آصف کہتے ہیں۔
آج تک تابندہ و رخشندہ ہے نام حسینؑ
روشنی کا راستہ بھی کیا کبھی روکا گیا
سوچ کے پہلو میں دشتِ کربلا جب آ گیا
جان لرز اٹھی مری اور دل مرا تھرا گیا

مل گیا ہے جس کو عرفانِ حسینؑ ابنِ علیؑ
وہ بشر صبر و قناعت کی حقیقت پا گیا

.....

ڈاکٹر شفیق آصف کی شعری کائنات میں کئی
طرح کی کہکشائیں جلوہ گر ہیں وہ صرف
غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ نوکِ قلم سے ہمہ
وقت حمد و نعت، سلام، منقبت، نثری نظم،
آزاد نظم، ماہیا، ہائیکو کے پھول بوٹے اگلنے
میں منہمک رہتے ہیں۔
ڈاکٹر شفیق آصف کے پنجابی کلام میں بھی یہی
ذائقہ و رنگ رس ملتا ہے جو اُن کی اردو شاعری
کا خاصا ہے۔ وہ ڈراما نگار، محقق، نقاد اور کالم
نگار بھی ہیں ڈاکٹر شفیق آصف کی بہت سی کتب
شائع ہو چکی ہیں اور بہت سی کتابیں زیرِ طبع
ہیں، ڈاکٹر شفیق آصف ایک بہترین استاد ہیں
اور ان کے بے شمار شاگرد زندگی کے مختلف
شعبوں میں اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں،
میری دلی دعا ہے کہ محبتوں کے اس پیامبر کے
قلب و ذہن پر اسی طرح خلوص و وفا اور محبت
کے صحیفے اترتے رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

اچانک اُس پر گھبراہٹ اور سنسنی طاری ہوگئی اور.....مامتا

''پنکی کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دادو کے پاس نہ بیٹھا کرو۔ دیکھتی نہیں انہیں کتنی بُری طرح کھانسی آ رہی ہے۔ تم بھی بیمار ہو جاؤ گی۔''

''ماما۔ دادو مجھے بہت دلچسپ کہانیاں سناتی ہیں، بڑی اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں۔''

''کہانیاں میں تمہیں سنا دیا کروں گی۔ مجھے تمہاری صحت کی بہت فکر رہتی ہے میری جان۔ اپنے کمرے میں کھیلا کرو۔''

''آپ کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔ کبھی کسی پارٹی میں جا رہی ہیں تو کبھی گھومنے پھرنے۔ گھر میں ہوں تو مجھ سے زیادہ موبائل پر توجہ دیتی ہیں''۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔ وہ جو کہانیوں کی اتنی کتابیں اور آڈیو وڈیو کیسٹس لا کر دی ہیں وہ کافی نہیں ہیں؟''۔

''بیٹا بچی ہے۔ میرے پاس بھی بیٹھنے دیا کرو اسے۔ میرا بھی دل لگا رہتا ہے۔''

''بس رہنے دیں ماں جی۔ آپ کا دل لگانے کے لئے اپنی بیٹی کو بیماریاں لگوا لوں۔ ہر وقت کھانسی رہتی ہیں آپ۔ سارے گھر میں جراثیم پھیلتے ہیں''۔

نرگس نے بے زاری سے کہا۔

''میرے کون سے تین چار بیٹے ہیں یا بہن بھائی زندہ ہیں جن کے پاس رہنے کے لئے چلی جایا کروں۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ ہی میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ اسی کے پاس رہنا ہے'' ساس نے افسردگی سے کہا۔

''یہی تو رونا ہے کہ آپ کو کہیں بھیج بھی نہیں سکتے۔'' بہو نرگس قدرے غصے سے یہ کہتی بیٹی کا بازو پکڑے پاؤں پٹختی کمرے سے باہر چلی گئی۔ بوڑھی ساس دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کی نمی پونچھنے لگی۔

''جیدے۔ یہ جو کوٹھی ہے نا۔ بڑے سے نیلے گیٹ والی''۔

''جی اُستاد جی''۔

''اس پر بڑے عرصے سے میری نظر ہے۔ تم دو تین دن اس کا اچھی طرح جائزہ لو۔ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ کون اور کب آتا جاتا ہے۔ کب سوتے ہیں۔ گھر کے مرد کام پر کب جاتے اور کب واپس آتے ہیں۔ ملازم کتنے ہیں، سب کی رپورٹ دو مجھے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں استاد جی۔ ساری معلومات مل جائیں گی آپ کو''۔ جیدے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں خود بھی نظر رکھوں گا''۔ دونوں باتیں

محمد شعیب مرزا

کرتے آگے بڑھ گئے۔

”بیٹا ہم کہاں جا رہے ہیں؟“۔

”ماں جی! ادھر قریب ہی جانا ہے“۔

گاڑی ایک عمارت کے باہر رکی۔ وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اندر لے گیا۔ عمارت پر لگے بورڈ کو دیکھ کر بوڑھی عورت کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں ابھری تھیں۔ دو چار جماعتیں پڑھی ہوئی تھی لیکن اس نے آنے والے خیال کو جھٹک دیا۔ اندر دفتر میں ایک خاتون نے ان کا استقبال کیا جیسے پہلے ہی سب کچھ طے کیا جا چکا تھا۔ اب ماں ساری صورتحال بھانپ چکی تھی۔ بیٹا اٹھ کر جانے لگا تو ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بیٹا مجھے یہاں چھوڑ کر مت جاؤ“۔

”ماں جی۔ یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ساری سہولتیں ملیں گی۔ ہم بھی ملنے آتے رہیں گے۔“ بیٹے نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا میں گھر کے کسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔ کم از کم تم لوگ میری نظروں کے سامنے تو رہو گے“ اُس نے التجا کی۔

”میں جب بھی گھر آتا ہوں نرگس آپ کی شکایتیں لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ بچی ہر وقت آپ سے چمٹی رہتی ہے۔ وہ بیمار بھی ہو سکتی ہے۔ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے“ وہ قدرے بیزاری سے بولا۔

”میں بھی تو تمہاری اکلوتی ماں ہوں۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ تمہارے سوا میرا کون ہے۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔ میری زندگی کے جو تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں وہ مجھے اپنے ساتھ گزارنے دو“ وہ گڑگڑانے لگی۔

اُس نے دفتر میں موجود عورت کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور بوڑھی عورت کا ہاتھ پکڑ کر سپاٹ لہجے میں کہنے لگی۔ ”آئیں ماں جی میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں“ اس طرح کے مناظر جیسے اس کے لیے معمول کی بات ہو۔

”ماں جی کا خیال رکھنا“ کہہ کر وہ بے رُخی سے باہر نکلا اور بوڑھی نم گرفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

”جیدے“۔

”جی اُستاد جی“۔

”آج تیاری کر لے۔ آج اس کوٹھی کا صفایا کرنا ہے۔ جو معلومات تو نے حاصل کی ہیں وہ سب درست ہیں نا؟“۔

”بالکل استاد جی۔ اب تو وہ اماں بھی وہاں نہیں ہے جو اکثر کھانستی رہتی تھی۔ میاں بیوی اور ایک بیٹی۔ زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی“ جیدے نے اطمینان دلایا۔

”جیدے ہم نے یہاں کی بڑی ریکی کی ہے، بڑا وقت صرف کیا ہے۔ کام پکا ہونا چاہیے۔ ناکامی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی کو پھڑکانا پڑے تو پھڑکا دینا۔ ہم نے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جانا“۔

”ٹھیک ہے اُستاد جی“۔

اس کے ساتھ ہی دونوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ رات کے پچھلے پہر گلی میں کوئی نہیں تھا۔ دونوں دیوار پھلانگ کر لان میں آ گئے۔ برآمدے

کے پاس آکر دونوں رُک گئے۔ اُستاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تار نکالی۔ اس تار کی مدد سے کوئی بھی دروازہ کھولنا استاد کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اُس نے دروازے کے لاک میں دو تین بار تار کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ باقی کام آسان تھا۔ ایک کمرے میں میاں بیوی اور بچی تینوں سوئے ہوئے تھے۔ دو کمرے خالی تھے۔ پہلے انہوں نے سٹور اور دونوں کمروں کی تلاشی لی مگر وہاں سے کچھ خاص مال نہ ملا۔ اگر وہیں سے مال مل جاتا تو واپس پلٹ جاتے۔ لیکن لگتا تھا سارا مال اُسی کمرے میں تھا جہاں وہ تینوں سوئے ہوئے تھے۔ دونوں نے ریوالور نکال لیے تھے۔ یہ تو وہ طے کر ہی چکے تھے کہ واردات کی کامیابی کے لئے کسی ایک یا تینوں کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑتا تو وہ دریغ نہ کرتے۔

وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اُستاد آگے تھا اور جیدا پیچھے۔ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اُستاد نے ہاتھ کے اشارے سے جیدے کو روک دیا اور سانس روکے کچھ محسوس کرنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہاں کوئی ہے۔ وہ تینوں کمرے میں سوئے ہوئے تھے تو پھر کون ہو سکتا تھا۔ بوڑھی عورت وہاں نہیں تھی ورنہ اس کی کھانسی کی آواز آجاتی۔

اُستاد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اُس نے بڑی وارداتیں کی تھیں بڑی خطرناک صورتحال کا بھی سامنا کیا تھا لیکن ایسی گھبراہٹ اور کیفیت اس پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ اسے لگا کہ اگر مزید وہ کچھ دیر وہاں رکے تو کوئی انہونی ہو جائے گی۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور ریڑھ کی ہڈی میں جیسے سنسنی دوڑ گئی۔ وہ واپس پلٹا۔ جیدے نے حیرت سے اُستاد کو دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

”اُستاد۔ یہ کیا؟۔ تُم نے تو کہا تھا کہ کسی بھی حال میں خالی ہاتھ نہیں لوٹنا، چاہے کسی کو پھڑکانا ہی پڑ جائے۔“

اُستاد نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”جیدے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے باہر نکل جائیں ورنہ.....“ فقرہ پورا کیے بغیر وہ باہر کو چل دیا۔ جیدا اُس کے پیچھے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں دیوار پھلانگ کر باہر نکلے اور گلی کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اولڈ ہوم کے ایک کمرے میں بوڑھی عورت سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اُس پر گھبراہٹ اور بے چینی طاری ہونے لگی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی وہ اولڈ ہوم میں تھی۔ اُس کا دھیان فوراً اپنے بیٹے کی طرف گیا۔ وہ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے بیٹے کے گھر کی طرف منہ کر کے پھونکیں مارنے لگی اور خشوع و خضوع سے دعا مانگنے لگی۔

”یا اللہ میرے بیٹے کی خیر، یا اللہ میری بہو کی خیر، یا اللہ میری بچی کی خیر......“

☆☆☆☆☆

''قیدی'' دہشت گردی پر لکھی کہانیاں

حمزہ حسن شیخ کا افسانوی مجموعہ ''قیدی'' ابھی ختم ہوا ہے اور مجھے تیرہویں عالمی کانفرنس میں مقررین کے پڑھے جانے والے مقالے یاد آرہے ہیں --وہاں موضوع تھا''دہشت گردی اور اُردو افسانہ''- معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین جب بھی اردو افسانے پر بات کرتے ہیں تو اُن کی بات چند معروف ناموں کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے؟

کبھی کبھار مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید اردو افسانے کا ناقد نیا افسانہ پڑھ ہی نہیں رہا، اگر وہ نیا افسانہ پڑھ رہا ہوتا تو دہشت گردی کے موضوع پر ہونے والی نشست میں کسی نہ کسی کو تو حمزہ حسن شیخ کا علم ہوتا--- گزشتہ دس برسوں میں دہشت گردی پر جتنی کہانیاں حمزہ حسن نے لکھی ہیں ،شاید ہی اُردو افسانے میں کسی نے اِس موضوع پر لکھی ہوں--

''قیدی'' حمزہ حسن کے افسانوں کا مجموعہ ہے، اِس میں شامل بیشتر کہانیاں سہ ماہی فنون میں شائع ہوچکی ہیں،۲۰۱۴ میں جب احمد ندیم قاسمی صاحب کے فنون کو اُن کی بیٹی اور نواسے نے پھر سے شائع کرنے کا اہتمام کیا اور شمارہ نمبر ایک سوچھتیس نکالا تو اُس میں افسانوں کے حصے میں بہت سے معروف ناموں کے ساتھ کچھ ایسے نام بھی تھے جن سے میں اُس وقت لاعلم تھا، اُنہی میں ایک نام حمزہ حسن شیخ کا تھا-- اُس شمارے میں اُن کا افسانہ ''خودکشی'' شائع ہوا تھا جو اِس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے--یہ اِس قدر دکھی افسانہ ہے کہ ذہن کے ساتھ چپک کر رہ جاتا ہے، چند کیڑے ہیں جو آپس میں گفتگو کررہے ہیں کہ اب نئے انسانوں کے گوشت کا ذائقہ بدل کیوں چکا ہے، اُس میں لوہے اور بارود کی بو ہوتی ہے، کیا نئے انسان لوہا کھا رہے ہیں؟

دو ہزار آٹھ اور نو کے وہ پریشان کُن دنوں کے بارے سوچتا ہوں تو ہر طرف اُداسی پھیل جاتی ہے، وہ کس قدر ڈراؤنے دن تھے کہ ہر روز کسی نہ کسی گاؤں، دیہات،

محمد جمیل اختر

شہر میں دھماکے کی خبر آجاتی تھی۔ بازار محفوظ تھے نہ کھیل کے میدان۔ مسجدیں محفوظ تھیں نہ گرجے۔ آدمی گھر سے کسی کام کو نکلتا تھا اور واپس اُسے کندھوں پر اُٹھائے لوگ آتے تھے۔۔ زندگی تو یوں بھی ایک ناپائیدار اور ناقابلِ بھروسہ شے ہے لیکن اُن تاریک دنوں میں تو لوگوں کو صبح سے شام ہونے کی اُمید بھی نہیں تھی۔

حمزہ حسن شیخ کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے، یہ وہ علاقہ ہے جو دہشت گردی سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ''قیدی'' میں شامل افسانے، سنی سنائی باتیں نہیں ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے مصنف نے اپنے علاقے میں ہونے والے اِن حادثات کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ بہت گہرائی میں محسوس کیا ہے۔۔

''نوٹ بک'' ایک ایسا افسانہ ہے جو دو ہزار چودہ کے آرمی پبلک سکول میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعے پر لکھا گیا ہے۔ آہ! وہ کس قدر دُکھی دن تھا، معصوم بچوں کو دہشت گردوں نے شہید کر دیا۔ اب بھی وہ تصاویر نظروں کے سامنے آجائیں تو دُکھ کی ایک شدید لہر سینے میں اُٹھتی ہے۔

میں اِس کتاب میں موجود کہانیوں کو پڑھتا ہوں، کہانی ختم ہوتی ہے تو بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہوں۔۔

''باغی'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس نے کانے مولوی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ جس معاشرے کا حصہ تھی وہاں یہ ناقابلِ قبول جرم تھا سو اُس باغی کو پتھروں کی سزا دے دی جاتی ہے۔

''قیدی'' افسانہ جو اِس کتاب کا نام بھی ہے، اِس کہانی کو اِس کی منفرد تکنیک کے حساب سے بھی ضرور دیکھا جانا چاہیے، جہاں ایک قیدی کہانی کا کچھ حصہ ڈائری میں بیان کرتا ہے اور پھر ڈائری کے باہر بھی ایک کہانی آپ کی منتظر ہوتی ہے، وہ اپنے تمام خدشات کو ڈائری کے سپرد کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب آگے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔۔ ڈائری سے باہر بھی ایک کہانی اُس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔۔

''کٹے پھٹے دھڑ کا مکالمہ'' بھی دہشت گردی کے موضوع پر لکھی ایک کہانی ہے جو خودکش دھماکے میں ہلاک ہونے والا ایک جسم بیان کر رہا ہے جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے۔۔ آخری جملہ ہے کہ

''اُس کے چھلنی بدن کے کئی حصے غائب تھے اور ایک مکمل تخلیق اپنے تخلیق کار کی جانب تباہ کن اور ناقابلِ شناخت حالت میں واپس چلی گئی''

اکیسویں صدی میں جو ممالک دہشت گردی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اُن میں پاکستان اور افغانستان سرِ فہرست ہیں، یہاں گزشتہ دہائیوں میں سب کچھ بدل گیا ہے۔۔

''انار گلے'' وزیرستان کی لوکیل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی کہانی ہے، ایک لڑکی جس کے بچپن میں اُس کا باپ افغانستان جہاد کرنے

چلا جاتا ہے، غربت میں وہ بڑی ہوتی ہے تو اُس کا بیاہ ایک اُزبک نوجوان سے کر دیا جاتا ہے جو آگے چل کر دہشت گردوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔۔ نسلوں کی نسلیں اِس دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں۔۔۔

ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جس کے پاس صرف ایک ریڑھی ہو اور وہی اُس کی کل جائیداد ہو، وہ بھی نہ رہے تو وہ شخص کیسا محسوس کرے گا۔ ''رحیمو کی ریڑھی'' ایسی ہی ایک کہانی ہے، رحیمو جو ایک ایسے پارک میں قلفیاں بیچتا ہے جہاں بڑے لوگ اپنے کتوں کو سیر کرانے آتے ہیں، ایک دن ایک امیر بیگم صاحبہ کا کتا اُس کے بیٹے پر حملہ کرتا ہے، رحیمو اپنے بیٹے کو بچانے کی خاطر ریڑھی کو دھکا دے کر کتے پر پھینک دیتا ہے جس کی زد میں آ کر کتا ہلاک ہو جاتا ہے، مقدمہ چلتا ہے اور رحیمو کو تین سال قید ہوتی ہے۔ اور کتے کی قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید دو سال قید کی سزا بھی سنائی جاتی ہے کیوں کہ وہ قیمت ادا کرنے سے قاصر تھا دراصل بیگم صاحبہ کا کتا بیس لاکھ کا تھا اور رحیمو کی ریڑھی محض پانچ ہزار کی۔۔۔ مگر وہ ریڑھی اُس کی کل جائیداد تھی۔۔۔

''بیری کا درخت'' افسانہ ایک ایسے وقت میں پڑھ رہا ہوں جب یہ خبریں گردش کر رہی ہیں کہ ملتان میں آم کے ہزاروں درختوں کو کاٹ کر ہاؤسنگ سوسائٹی بنائی جا رہی ہے، لوگ سوشل میڈیا پر احتجاج کر رہے ہیں مگر تیسری دنیا میں عوام کی آواز کون سنتا ہے، پہلے بھی جنگل کاٹ کر کنکریٹ کے محل بنائے گئے، آگے بھی بنائے جائیں گے، کیپٹلزم میں فیصلہ اُسی کا مانا جاتا ہے جس کے پاس رقم زیادہ ہوتی ہے۔۔

ناعاقبت اندیش قومیں اِسی طرح اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں سے تاریک کرتی ہیں، پہلے شہروں میں درخت کم ہوتے جا رہے تھے اور اب تو گاؤں دیہات میں بھی کٹائی کا عمل تیزی سے جاری ہے۔۔ حمزہ حسن کا یہ افسانہ پڑھ کر مجھے احمد ندیم قاسمی صاحب کا افسانہ ''آسیب'' یاد آ گیا جس میں ایک بوڑھے آدمی کو درخت سے بیحد محبت تھی لیکن اُس کے بیٹے اور بہو کو گھر میں درخت کا وجود گوارہ نہیں تھا۔۔ حمزہ حسن کے افسانے کا کردار بوڑھا نمازی بھی چاہتا ہے کہ بیری کا درخت موجود رہے مگر نئے لوگ ایسا کب چاہتے ہیں؟

''درد کی ٹہنیوں میں بلبل'' افسانے کا اختتام ایک عجیب سوگواری میں مبتلا کر دیتا ہے، شاید ہر محبت کی ایسی کہانی جس میں کردار باقی نہ رہیں آدمی کو اُداس کر جاتی ہے۔۔۔

اِس مجموعے کو ''فکشن ہاؤس'' نے لاہور سے شائع کیا ہے، افسانے کے قارئین کو اور ناقدین کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔۔

☆☆☆☆☆

اے رسول امیں اور ریاض حسین زیدی کی ریاضتیں.....!

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ریاض حسین زیدی اپنے وراثتی پس منظر کے ساتھ ادبی خدمت اور ان کے تحفظ میں پیش پیش رہنے کے اعتبار سے بہت زیادہ احترام کے مستحق ہیں۔ وہ بیک وقت متعدد ادبی اصناف میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ادبی روایت کو بڑی چابکدستی سے اپنے فن کا حصہ بنایا۔ آپ کا اسلوب دلکش اور لفاظی منفرد ہے۔ جس میں آپ کے احساسات و جذبات کی بہترین ترجمانی موجود ہے۔ آپ کے موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ بے سروپا اور ہوائی باتوں کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپکی تحریروں میں صداقت اور حق گوئی کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ روانی فراوانی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ کی تصانیف اپنے عہد کے حالات، مزاج و کیفیات سماجی رشتوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ معمولی باتوں کو غیر معمولی انداز میں کرنے کے ماہر ہیں۔ یہ ساری خوبیاں انھیں یونہی میسر نہیں آ گئی ہیں۔ بلکہ ان کے حصول کے لیے ان کی برسوں کی محنتوں اور ریاضتوں کا عمل دخل ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے ان کی ادبی اہمیت اور مرتبے کو مسلسل اجاگر کیا۔ اور انھیں تواتر کے ساتھ ادبی سفر پر گامزن رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد نعت اور سلام کی اصناف کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یوں تو ان اصناف کی روایت خاصی قدیم ہے۔ لیکن قیام پاکستان سے قبل یہ روایت ایک عمومی جذبے کے ساتھ

خالق آرزو

چل رہی تھیں- جس میں اقبال ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں- تاہم ماضی بعید میں حمد و نعت کی اصناف کو نئے شعور سے متعارف کرانے اور مجموعہ ہائے نعت کی روز افزوں اشاعت کے ساتھ ان اصناف کے لئے مختص کیے گئے رسائل وجرائد نیز ،،نعت سنٹر،، جیسے اداروں کے قیام نے حمد و نعت کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا- جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اظہار عقیدت سے آگے نکل کر یہ اصناف ادب میں ایک مستقل اہمیت کی حامل قرار پائیں- اس حوصلہ افزائی نے ایک طرف حمد و نعت کو ساعت کے دائرے سے نکال کر حمدیہ اور نعتیہ مجموں کو بے کرانی عطا کی- تو دوسری طرف ان اصناف کے ادبی قد کاٹھ، فکری پھیلاو اور لسانی معاملات پر مباحثے کی راہ ہموار کی- ریاض حسین زیدی ادبی حلقوں میں پذیرائی کے مرحلے بہت پہلے طے کر چکے ہیں- وہ قومی اور صوبائی سیرت ایوارڈ بھی اپنے نام کر چکے ہیں- آپ کی شاعری پڑھ کر قلبی آسودگی اور ولی اطمینان کا احساس دامن گیر رہتا ہے- وہ شعری اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہیں-

،،آپ کے متعلق خورشید بیگ میلسوی کی رائے ...... سید ریاض حسین زیدی دیار روایت اور زمانہ جدت کے امتزاج سے وہ نعتیہ حسیت پیدا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں- جو انھیں کا حصہ ہے- انھوں نے اپنے قلم کی رفعت کو دل و دماغ کی مقدسات کو خانہ ءالفاظ وتراکیب سے منزہ کیا اور پھر خوشبو، رنگ، نزہت، نکہت، روشنی کی روشنائی سے انھیں خامہ ء ہدایت پر رقم کیا ......مضامین کی نئی جہات کی عطا سند قبولیت سے کم نہیں- بہت زیادہ لکھنے کے باوجود مضامین کا تنوع، ندرت عدم تکرار کرامتِ تخلیق سے کم نہیں،،

آپ بارگاہ رسول کی حاضری کے دوران دربار نبی تک آواز کی رسائی اور الفاظ کی نزاکتوں کا خیال رکھنا بھی خوب جانتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ زیدی صاحب کی حمد و نعت جذبہ بھی ہے- اور تخلیقی وفور بھی اور قدرت اظہار بھی .... یوں بھی نعت کے چراغ انکے دل میں روشن ہوتے ہیں- جسے یہ چراغ اپنے روغن چشم سے فروزاں رکھنے کی توفیق مل گئی ہو- میں سمجھتا ہوں کہ زیدی صاحب اس توفیق سے سرفراز ہیں- بصورت دیگر ،،اے رسول امیں،، اور اس سے قبل،، جمال سید لولاک،، ریاض مدحت،، اور ذکر شہ والا،، کی سعادت نصیب ہونا محال تھی- لہٰذا اس یقین کے پیش نظر میں آپ کو مقبولیت اور قبولیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں-

عرفی نے کہا تھا نعت لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے- گویا وہ کہنا چاہتے ہیں- کہ ادب تہذیبی لوازم کے ساتھ شعری

جمالیات کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔
چند مثالیں:

ہر ذرہ خاکی بھی چمک اٹھا ہے بے حد
احسان ہے یہ گنبد خضریٰ کے مکیں کا

.....

وہ در پر بلائیں گے ریاضؔ آپ کو اک دن
یہ حاضری احسان ہے بطحا کے امیں کا

.....

مریضانِ غم کی شفا آپ ہیں
شکستہ دلوں کی بقا آپ ہیں

.....

بسا آنکھوں میں انکا نقش پا ہے
فروزاں ہو گیا ہر راستہ ہے

.....

سرکارؐ دو عالم سے محبت ایک لازمی عنصر ہوتے ہوئے بھی نعت نگار کے لیے اس عظیم ذات کی تفہیم کے بغیر نعت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کہنے کا مقصد ہے۔ کہ عمومی شاعری والے تصورات نعت میں کسی طور زیب نہیں۔ وہ نعت گو جن کے اشعار میں بے تکلفی کا احساس پایا جائے۔ میرے نزدیک ہرگز تعظیم کی کڑی شرائط پر پورا اترنے کے لائق نہیں گردانے جاسکتے۔
میں نے یہ محسوس کیا ہے۔ اور میرے دیگر رفقا کی آرا سے بھی آپ نے اندازہ لگایا ہوگا۔ کہ زیدی صاحب حفظ مراتب کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ سادگی اور بلاغت آپ کی نعت کا نمایاں وصف ہے:

خدا کا شکر ہے انکی بڑی عنایت ہے
میں خوش نصیب ہوں کہ آپ سے جو نسبت ہے

.....

خدا چاہتا ہے مقدر سنوارے
جو چاہے اسے وہ نبی کو پکارے

سخن انکا شیریں کمال انکی سیرت
حمیدہ ہیں اوصاف سارے کے سارے

.....

زیدی صاحب کے مضامین میں حمد و نعت روایتی نہیں بلکہ روایت میں جدت کے حامل ہیں۔ آپ کا تخیل بلند پروازی کی طرف گامزن ہے اور فکر ندرت سے مزین ہے۔ ان صلاحیتوں نے آپ کو ایک اعلیٰ و ارفع نعت نگار کے منصب پر فائز کیا ہے۔ بلکہ ان اصناف کے لکھنے والوں میں ایک بلند مقام عطا کیا ہے۔ اس اعزاز کے پس منظر میں آپ کی دینی وابستگی کے علاوہ ادبیات کے مطالعہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حمد و نعت آپ کی زمینِ دل میں لگے شجرِ محبت پر شاخ در شاخ کھلنے والے وہ پھول ہیں۔ جن سے پھوٹنے والی مہک باغ حمد و نعت کو معطر کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ کی یہ متاع خلوص نہ صرف زمانہ حاضر میں بلکہ آنے والے وقتوں میں بھی ایک گراں قدر تصنیف سمجھی جائے گی۔

نعت گوئی ریاضؔ کا فن ہے
ہو نظر میں بس آپکا منظر

☆☆☆☆☆

بے چارہ شوہر [مزاحیہ مضمون]

محمد ہمایوں خان

ایک بیوی کئی سالے ہیں خدا خیر کرے
کھال سب کھینچنے والے ہیں خدا خیر کرے
میرا سسرال میں کوئی بھی طرف دار نہیں
اُن کے بھی ہونٹوں پہ تالے ہیں خدا خیر کرے

.....

سیانے کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے یہ بات سو فیصد دُرست ہے مگر آج کے دور میں بیوی کی خوبیاں تلاش کرنا ایسا ہے جیسے اپنی خامیاں تلاش کرنا۔ اُمید ہے میری تحریر شادی شدہ حضرات پر گراں نہیں گزرے گی، بالکل اسی طرح جس طرح لوگ حلیم بڑے مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ بھئی! اگر واقعات اور حالات خلاف مزاج ہوں تو معذرت خواہ ہوں لیکن اگر اس ملک کے سیاستدان، بیروکریٹس، واپڈا، سوئی گیس، ریلوے حتیٰ کہ ہر محکمے والوں کو ان کی بدعنوانیوں کے باوجود چھوٹ مل سکتی ہے تو ہم لکھنے والوں کو کیوں نہیں.....؟

مجھے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ سدھر جائیں اس موضوع پر مضمون نہ لکھیں تو میں نے جواب دیا کہ بھئی جب ہمارے کھلاڑی میچ فِکس کر سکتے ہیں، سیاستدان

بھیک مانگ سکتے ہیں۔ پشاور میں ایک دن پہلے چاند نظر آسکتا ہے، پرائیویٹ ادارے بغیر کسی وجہ کے فیس بڑھا سکتے ہیں، شوبز والے رمضان المبارک میں نعتیں پڑھ سکتے ہیں، جب وینا ملک ملی نغمہ گا سکتی ہیں اور تو اور جب ہمارے بھولے بھالے معصوم شاعر دوست مظہر جاوید غزل لکھ سکتے ہیں تو میں شادی شدہ حضرات پر کیوں نہیں لکھ سکتا.....؟

حضرات جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو عام کنواروں کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ عمر قید بامشقت بیگم اقدس کے ساتھ گزاروں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کنوارہ بے چارہ اور احمق ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت اصل بے چارگی اور احمقی تو شادی کے بعد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ میری شادی سے پہلے کی احمقی یہ تھی کہ شادی کی خواہش اتنی زور پکڑ گئی کہ میں روزانہ صلوٰۃِ حاجات پڑھاتا تھا تمام کنواروں کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد مجھے بھی شادی کا سہرا باندھا جائے۔ بقول شاعر

نہ بنگلہ، نہ گاڑی، نہ ٹی وی نہ پکچر سنیما
نہ سیونگ اکاؤنٹ نہ جیون کا بیمہ
مجھے اِک کنوارے کی خواہش پتہ ہے
ولیمہ ولیمہ ولیمہ ولیمہ

مگر جس دن سے شادی ہوئی ہے اُس دن سے آج تک روزانہ صلوٰۃ توبہ پڑھتا ہوں لیکن شادی ایسا عمل ہے کہ آج تک معافی نہ ملی۔ میری حالت زار دُنیا کے تمام شوہر حضرات کی حالتِ زار کی حقیقت پسندی کی تصویر ہے۔ دُنیا کا ہر شوہر زندگی کے ابتدائی بیس سال والدین کی فرمانبرداری میں گزارتا ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد مزید تیس سال بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور مزید زندگی نصیب ہو تو پھر جیتے جی اللہ کا ہو جاتا ہے۔ تو بھئی! ہے نہ شوہر دُنیا کا واحد بے چارہ.....!

دُنیا کی وہ عورت جس کو آپ کبھی خوش نہیں رکھ سکتے وہ بیوی ہے اور جس سے آپ کبھی کبھی خوش نہیں رہ سکتے وہ بھی بیوی ہے۔ آج کے جدید سائنسی دور میں اچھے مزاج کی بیوی ملنا آفاقی اور سائنسی معمہ بن چکا ہے۔ میں بھی ایک شادی شدہ انسان ہوں۔ بے بس اور بے یار و مددگار ہوں۔ بخدا میں بیوی سے نہیں ڈرتا مگر جس طرح آج کل کے شوہروں کو گھبراتے اور بے بسی کے عالم میں دیکھتا ہوں تو ذہن مفلوج اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ صاحبان میں لڑنے جھگڑنے، اپنا حق جتانے اور اپنا رُعب جمانے سے بھی

نہیں ڈرتا مگر جب بیوی روٹھ کر میکے جانے کی دھمکی دیتی ہے تو پھر میں بھی ماندہ پڑھ جاتا ہوں کیونکہ ہیڈ آفس یعنی کہ سسرال والوں سے تو حقیقت میں ہر شوہر پناہ مانگتا ہے، کیونکہ سسرال تو سسرال ہوتا ہے، چاہے میرا ہو یا آپ کا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

سسرال میں ڈٹ جائے جو بیوی کے مقابل
دُنیا میں کوئی ایسا جیالا نہیں دیکھا

....

شادی کے دن گھوڑے پر بٹھانے کی رسم بھی ہوئی۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ شوہر کے لئے بھاگنے کا آخری موقع ہوتا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ کاش اُس وقت بھاگ جاتا تو زندگی بن جاتی۔ جناب یہ بیویاں بھی عجیب ہوتی ہیں اور ان کے اقوال بھی منفرد ہوتے ہیں پچھلے دنوں کسی بات پر میری بیگم سے لڑائی ہوئی تو میری بیگم اقدس فرمانے لگی "یا اللہ! اگر میرے میاں غلط ہیں تو ان کو اس دُنیا سے اُٹھا لیں اور اگر میں غلط ہوں تو مجھے آج ہی بیوہ بنا لے"۔

آپ بھی سوچ رہیں ہونگے یہ کیسے شوہر سے پالا پڑا ہے کہ اپنی داستانِ بے بسی کھلم کھلا سنا رہا ہے مگر عرض ہے کہ ہم سب شادی شدہ حضرات ایک ہی کشتی کے مسافر اور ایک جیسے بھنور میں پھنسے ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ابھی حال ہی میں اس بحرِ بے کراں میں اُترا ہوں۔ بس اتنا کہوں گا کہ:

چھ مہینے ہی میں یہ حال کیا بیوی نے
سال بھر بعد تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
اس طرح رکھتی ہے وہ دبا کر ہم کو گھر میں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

....

بعض شوہر حضرات کو ہم نے بنفسِ نفیس دیکھا ہے کہ شادی سے پہلے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں مگر بعد میں ان کی رال ٹپکتی دیکھی ہے۔ یہ دیکھ کر تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں کہ بعض شوہر صاحبان تو بچوں کو فیڈر بھی پلاتے ہیں۔ جھاڑو لگانا، کپڑے دھونا حتیٰ کہ ہانڈی بنانا تو آج کل شوہروں کے لئے چیلنج بن چکا ہے۔ کنوارے حضرات کو ان باتوں پر یقین نہیں ہوتا مگر وہ جو تا حال خوش نصیب ہیں اور بیوی کی نعمت سے محروم ہیں ان کے لئے اتنا کافی ہوگا کہ:

خوش نہ ہو اگرچہ یہ تیری بارات ہے
جان جائے گا تو جلدی کیا تیری اوقات ہے
ازدواجی زندگی کی حقیقت ہم سے پوچھ
چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے

....

دوستوں! تخیل کے حدود تک میں بھی بہت

خوش قسمت ہوں کیونکہ رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب کیا تھا جیسے انعامی بانڈ نکل آیا ہو۔ اعلان سنتا ہوں کہ حضرات ایک ضروری اعلان سماعت فرمایئے۔ راقم الحروف کی زوجہ اقدس بقضائے الٰہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہیں۔ اور اُن کو انجام خاک تک پہنچانے کے لئے آج رات 9 بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن ہماری یہ خوش خوابی بہت محدود وقت تک کے لئے ہمیں میسر آئی تھی کہ اس دوران واپڈا والوں کی کوتاہی کی وجہ سے ہماری چند لمحوں کی مرحومہ زوجہ اقدس نے ہمیں جنریٹر لگانے کا حکم نامہ صادر فرما کر ہمیں خواب غفلت سے حقیقت کی دُنیا میں لے آئیں۔

اکثر اوقات حقیقت ہماری زندگیوں میں تلخیاں لے کر آتیں ہیں اور ہم شوہروں کا شمار تو شاید دُنیا کے اُن عجوبوں میں ہوتا ہے جن کا کوئی بھی نمبر مقرر نہیں ہوا ہے کیونکہ کوئی اُن کو پہلے نمبر پر رکھنا چاہتا ہے اور کوئی آخری، یہی وجہ ہے کہ یہی عجیب الخلقت حضرات سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی اپنی گردن اُونچی رکھنے کے لئے لمبی لمبی چھوڑنا شروع کر دیتے ہیں اور وہاں پر اُن ہی کی مداح سرائی کر رہے ہوتے ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے کیا خوب گایا تھا

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہیں شکوے کیا کیا بتاؤں

.....

اُلو کو پرندوں کا فلاسفہ کہا جاتا ہے مگر میری رائے ہے کہ بیوی عورتوں کے ہر شعبے کی فلاسفر ہے مگر افسوس کہ جس طرح ہمارے ٹرانسپورٹ سے تانگے اور بگیاں ناپید ہوگئی ہیں اس طرح الہ دین کا چراغ لے کر پھر ڈھونڈنے سے بھی اچھی بیویوں کا حصول سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

بھئی! آپ کیوں پریشان ہوئے اگر شاذو نادر آپ کی بیوی اچھی، نرم مزاج، شگفتہ اخلاق، ملنسار، ہمدرد، مخلص اور باکردار ہے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ آپ کا اور نہ ہی آپ کی بیگم اقدس کا کمال ہنر ہے بلکہ یہ سب ان کے والدین کی اچھی اور مثبت تربیت کا کمال ہے۔ جو والدین اپنی بچیوں کی اعلیٰ اور بہترین تربیت کرتے ہیں تو بچیاں اخلاق، سیرت و کردار، صبر و تحمل، برداشت، سلیقہ مندی، عزت وانا اور تمام رشتوں ناتوں کی پاسداری اور خانہ داری چلانے کے تمام گُر سیکھ لیتی ہیں۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین بچیوں کی اعلیٰ تربیت کریں۔ آپ کا کیا خیال ہے.....؟

☆☆☆☆☆

زندگی

نگاہوں کے تماشے
مظاہر زندگی کے
پرندوں کی اڑانیں
درختوں کی کمانیں
یہاں پانی میں کائی
پہاڑوں سی ہے رائی
وہاں پتھر میں کرمک
جہاں ہاتھوں پہ کالک
سمندر میں سفینے
مظاہر زندگی کے
فقیروں کی دعائیں
محبت کی وفائیں
بہت ہے رونا دھونا
اک آفت ہے کرونا
بھلا اب کون دیکھے
مظاہر زندگی کے
نہیں ہے آنا جانا
کہاں گانا بجانا
اداسی چھا رہی ہے
گھروں پر بال کھولے
در و دیوار چپ ہیں
ہوئیں ویران بزمیں
ورق بکھرے پڑے ہیں
یہ کیسے واقعے ہیں
غبارے ہیں جھمیلے
رہیں گے ہم اکیلے
مناظر زندگی کے
مظاہر زندگی کے

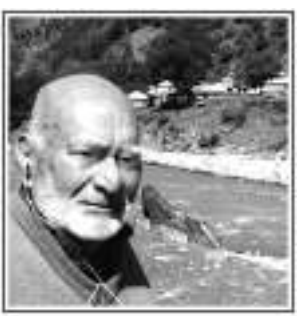

آصف ثاقب

دھول میں پھول

ہر منظر پر اُسی پرانی حیرت کو دہراتے ہیں
دل کو گھیرے میں رکھتی ہے ایک عجب یکسانی سی
ہوتا تو ہے کھیل وہی کردار بدلتے جاتے ہیں

جن لوگوں نے آگے چل کر
جگ میں دھوم مچانی ہو
اکثر ہم نے دیکھا ہے وہ
بالکل ہی بے نام گھروں میں پل کر نام کماتے ہیں
جیسے خود رَو پودے اکثر ان راہوں پر کھلتے ہیں
جو نظروں سے اوجھل ہوں یا لوگ وہاں پر
کم کم آتے جاتے ہیں

قسمت کا یہ کھیل ہے یا پھر راز ہے کوئی گہرا سا
جیسے وقت رواں ہو لیکن لاگے ٹھہرا ٹھہرا سا
کئی پرانے قصّے پھر سے یوں آتے ہیں یاد ہمیں
رُکے ہوئے پانی میں جیسے کنکر گرتے جاتے ہیں

''سیپی کی گمنام فضا میں ہیرے کیسے بنتے ہیں
اور اچانک خوابوں میں تعبیر کہاں سے آتی ہے
کیونکر تاروں کی گردش سے بخت بدلنے لگتے ہیں
بند آنکھوں کے پردوں میں تصویر کہاں سے آتی ہے''

غربت اور ویرانی دونوں جوہر کو چمکاتے ہیں
امکانوں میں چھپے خزانے منظر پر لے آتے ہیں
پسی ہوئی مخلوق کبھی جو دکھلاتی ہے اپنے گُن
بے آباد زمیں سے کیا کیا پھول نکلتے آتے ہیں

امجد اسلام امجد

'بازگشت'

تیری قربت کی مہک
رات کی تنہائی
اک بھولا سا خواب

تیری نظروں کا فسوں
درد کی شہنائی
لمحوں کا سراب

تیرے ہونے کا وہ لمس
دشت کی پہنائی
سانسوں کا رُباب

تیرے لہجے کی کھنک
لفظ کی رعنائی
سوچوں کا عذاب

☆☆☆☆☆

سید افسر ساجد

'پرتو'

آج پھر اُس کی صدا آئی ہے
یہ صدا دُور کی آواز ہے دُوری کی صدا
فرحتِ جاں بھی ہے اور
راحتِ احساس بھی ہے
ان کہی اُس نے کہی
ضبطِ فغاں کی صورت
اُس کے لہجے کا ترنگ
اس کی نظر کا آہنگ
ایک پرتو ہے
مرے اپنے صنم خانے کا
وہ صنم خانہ جہاں
میں نے سجا رکھا ہے
اپنی گمنام سی خواہش کا
المناک جہاں

بہار

کبھی میں نے
محبت کے پرندوں کی
نوا سنجی سے
گھر خالی
نہیں دیکھا
کہاں کس نے
دوامی مہربانی کا
ہنر عالی
نہیں دیکھا
رہے غافل
گلستاں سے
کوئی بیدار خو
خالی نہیں دیکھا
لگاؤ ہے
لگن رب کی
صفاتی
دلبری
جس کو
سدا میں نے
بروئے کار دیکھا ہے
محبت کو
بہار آثار دیکھا ہے

راستی کا سفر

سچ ہے زور آوروں کے پہرے میں
سامنے کس طرح کی بستی ہے
سرنگوں شر کے سامنے دیکھی
زندگی خیر کو ترستی ہے
جرم سے پیشتر سزا کا نفاذ
ہے یہ پہچان کس قبیلے کی
خود پرستی کے اس خرابے میں
جرم ہے آئینہ دکھانا بھی
جاں کریں تجھ پہ ہم فدا لیکن
تو اسیر ایسے موسموں میں ہوا
جب ہے انصاف خود کٹہرے میں

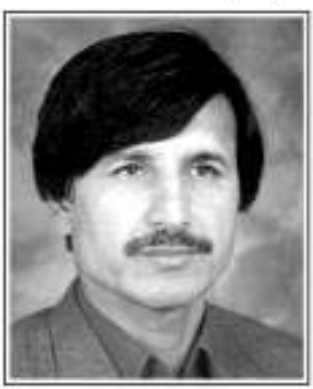

گلزار بخاری

ماں ترے بغیر

خوشبو ، چراغ اور نہ دھواں ماں ترے بغیر
ویران ہو گیا ہے جہاں ماں ترے بغیر
وحشت سی ہو رہی ہے در و بام سے مجھے
کھانے کو آ رہا ہے مکاں ماں ترے بغیر
پونچھے گا کون اشک لگا کر مجھے گلے
سمجھے گا کون میری زباں ماں ترے بغیر
جس میں تری دعا کا حوالہ تھا میرے پاس
وہ شہر کھو گیا ہے کہاں ماں ترے بغیر
اللہ کے علاوہ بھری کائنات میں
کس کو تھی میری فکر یہاں ماں ترے بغیر
دنیا تو کیا کہ خلد بھی مجھ کو نہیں قبول
میں ایک پل رہوں نہ وہاں ماں ترے بغیر
جو ہو سکے تو مجھ کو بُلا لے جہاں ہے تُو
میں کیا کروں گا رہ کے یہاں ماں ترے بغیر

راحت سرحدی

کرامت بخاری

جنگ

موت بانٹنے والو!
باغِ زندگانی کی، شاخ کاٹنے والو
موت کی تجارت میں
سب کا ہی خسارہ ہے
بھوک کے اضافے پر خوش نہیں ہوا کرتے
جنگ جیتنے والو!
جنگ کس نے جیتی ہے
تم بھی ہار جاؤ گے میں بھی ہار جاؤں گا
موت جیت جائے گی

کچھ بھی نہیں ہُوا

چہرے کی وہ کتاب
جس کا ہر ایک لفظ
میں نے نہیں پڑھا

دل کے اُفق پہ بھی
اُس کے بدن کا دِن
اب کے نہیں چڑھا

دیدار کا کنول
آنکھوں کی جھیل میں
کب سے نہیں کھلا

ہونے کو آج تک
جو کام بھی ہُوا
پورا نہیں ہوا

ہم پانی سے ڈرتے ہیں

ہم کشتی کھینے والے ہیں
پھر کیوں پانی سے ڈرتے ہیں
صحرا میں مشعل روشن ، بستی میں گھور اندھیرا ہے
قافلے والوں کو رستے میں اک آسیب نے گھیرا ہے
خیموں میں ہے آگ کا منظر باہر خوف کا ڈیرا ہے
ہم گل ہیں شاخِ طوبیٰ کے
اور ویرانی سے ڈرتے ہیں
مقتل میں سناٹا ہے اور ہر سو پیاس کا صحرا ہے
پھولوں جیسے رخساروں پر رنگ لہو کا گہرا ہے
اِک آواز کی گونج ہے لیکن عالم گونگا بہرا ہے
ہے ردِ عمل بس میں ، تاہم
نافرمانی سے ڈرتے ہیں
لاکھ تمھارے جیسے ہیں ، ہم سا نہیں ایک بھی دُنیا میں
تم گلشن میں کانٹے اور ہم پھول کھِلائیں صحرا میں
بیٹھ تماشا دیکھ رہے ہو آگ لگا کر دریا میں
برباد کرو گے سبزہ و گل
سو ہم پانی سے ڈرتے ہیں !

خاور اعجاز

مونتاژ

کِس کی دُھن میں زرد سمندر کی لہریں
سطروں سطروں بہتی ہیں
چاند۔۔۔ یہ ہلکا پیلا چاند
کسی مچھلی کی صورت
پانی کی محرابوں میں نظمیں جڑتا ہے
۔۔۔ نظم آغاز یہاں سے ہوگی
حرف اور رنگ تو آج بھی میرے جال میں ہیں
کاغذ کاغذ فاصلے ماہ و سال میں ہیں
کائی لگے پتھریلے پتھر
فصلِ سفر کے نازک لمحے
بوسیدہ مخطوطوں کی صورت خستہ ہوتے جاتے ہیں
ماضی کا بیرونی دروازہ جو بند ہے
ونڈ چائیم میں جھولتی لوری درد سناتی ہے
تم برلن میں، اپنے گھر کی بالکنی سے
یا اِس نظم کے ساحل سے
سیپی سیپی بکھری تنہائی کو دیکھو
دیکھو، دل کا جزیرہ کیسے
سوکھے خواب کی پُرنم تعبیروں کے نیچے دب سا گیا ہے
لفظوں کا اک اور پہر ڈھلتا جاتا ہے

وقت کی تہہ میں وقت کوئی چلتا جاتا ہے

---نظم یہاں کچھ دیر رکے گی، سانس برابر کرنے کو

لائٹ ہاؤس اور کلیسا کے پہلو سے چھنتی سفیدی اور نیلاہٹ

جھاگ اڑاتی موجیں، پرچم اور اک کشتی

سرد ہوا، اک حرف دعا

حرف دعا کا لمس نمک جیسا لگتا ہے

دیکھیں، حرف اور رنگ کی موجیں کس ساحل پر ٹھہریں

کس کی دھن میں زرد سمندر کی لہریں

سطروں سطروں بہتی ہیں

یادوں جیسی بھیگی آہٹیں کیا کہتی ہیں

یہ سننے کو جانے کیسی ریت آئے گی!

---نظم یہاں پہنچے گی اور رک جائے گی۔

حامد یزدانی

حدِ امکاں [نذرِ قائداعظم]

سنو یہ کیسے ممکن ہے
کہ اِک خاموش سا تارہ
بہت معصومیت سے
اِک کنارے پر فلک کے، روشنی پھیلا رہا ہو
اور اچانک چاند بن جائے

سنو یہ کیسے ممکن ہے
زمیں پر حبس ہوا تنا
کہ یوں محسوس ہوتا ہو
ہوا کو آہنی پنجرے میں کوئی ڈال آیا ہو
مگر پھر ابر کا چھوٹا سا ٹکڑا آئے
اور ایسی گھٹا بن جائے
جو تبدیل کر دے
دل کے اور دنیا کے موسم کو

سنو یہ کیسے ممکن ہے
کہ ہم موجود اور موہوم کے تنہا سفر میں
منزلوں سے بے خبر، یونہی بھٹکتے ہوں
تو خود رستہ ہمارا ہاتھ تھامے
اور منزل آپ چل کر پاس آجائے
سنو یہ کیسے ممکن ہے
کوئی ملت جو اپنے خواب سینے سے
لگائے سو رہی ہو
اِک فرشتہ آ کے اُس سے یہ کہے
اُٹھو۔۔۔اُدھر دیکھو
وہاں ہر خواب کی تعبیر رستہ دیکھتی ہے
اب یقیں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلو
ہم کو ستم کا ایک دریا پار کرنا ہے
سنو یہ کیسے ممکن ہے
مگر ممکن بنا
سارے زمانے نے یہ دیکھا کہ
گماں ایمان میں کیسے بدلتا ہے
اور اِک چھوٹا سا تارہ چاند بنتا ہے
کبھی رستہ کسی کے ساتھ چلتا ہے
کبھی اِک فرد واحد قوم کی قسمت بدلتا ہے
اور اُن کے خواب کی تعبیر
اُن کے ہاتھ میں دے کر یہ کہتا ہے
اِسے اب ٹوٹ جانے
اور بکھرنے سے بچانا ہے۔۔۔

حمیرا راحت

کووڈ 19

جس کو دیکھو مبتلا ہے کرب میں آزار میں
موت بھاگی پھر رہی ہے کوچہ و بازار میں

اس وبا نے قریہ قریہ بخش دیں ویرانیاں
خوف کا آہنگ تھا ہر ایک دل کے تار میں

رونقیں بھی ختم ساری محفلیں بے رنگ ہیں
دن گزرتے جا رہے ہیں اب اسی آزار میں

آج کل سہمے ہوئے ہیں خوشبوؤں کے قافلے
دھول اڑتی پھر رہی ہے دل کے لالہ زار میں

آزمائش کی گھڑی ہے یا گناہوں کی سزا
سب الجھ کے رہ گئے ہیں اب اسی تکرار میں

اس وبا کو، اس بلا کو ٹال دے تو اے خدا
کر رہے ہیں التجا ہم سب ترے دربار میں

تسنیم کوثر

[بیادِ سلیمی]

ہُوا نقش دل پہ یوں نام سلیمی
کبھی کم نہ ہو گا مقام سلیمی

صدا اُس کی گونجے گی ہراک طرف
ہر اِک شام میری ہے .....شام سلیمی

خیالوں میں میرے سلیمی رہے گا
ہر اِک شعر میرا بنام سلیمی

غم و درد کی چار سُو وادیاں ہیں
صبح و شام ہے واں خرام سلیمی

ستتر (۷۷) ہیں دیوان فاروقؔ اَب تک
ہوئی اِن میں شامل شام سلیمی

سلیمی تجھے بھول جاؤں میں کیسے
جو گزری ہے مجھ پر بتاؤں میں کیسے
کہ اک عہد یکجا گزارا ہے ہم نے
تجھے عمر بھر دیکھا ہے چشمِ نم نے
اُداسی میں میرا سہارا تھا بنتا
تُو دل جوئی میری ہمیشہ تھا کرتا
کہ غمگین ہوتا مرے ساتھ تُو تھا
کہ شعری سفر میں مرا ہاتھ تُو تھا
یقیں ہے کہ ہم آخرت میں ملیں گے
اوراک دوسرے کی سفارش بنیں گے
خدایا ترے ہم گنہگار بندے
خدایا خدایا کرم ہم پہ کر دے
اے استاد تم پر ہو رحمت خدا کی
شفاعت نبی جی کی شفقت خدا کی

زبیر فاروق

سوال

یہ بتاؤ کہ جی میں کیا آئی
کیوں یکایک جدائی کی ٹھانی

تم کو اپنا سمجھ رہا تھا میں
دور کر دی یہ میری خوش فہمی

کوئی شکوہ نہیں ہے تم سے مگر
یہ طبیعت بدل گئی کیسی

آنکھ تم کو تلاشتی ہے اور
دل کی جاتی نہیں ہے بے چینی

زخم دیتے نہ تم بچھڑنے کا
زندگانی تو بار یوں بھی تھی

صرف اتنا مجھے بتاؤ تم
راس آئے گی کیا تمھیں دوری؟

تُو کہ ناواقفِ محبت است
چہ علاقہ ز دردِ مہجوری

شوکت محمود شوکت

کہانی مکمل پرندوں نے کی تھی

مرے باپ نے جب
مکاں بیچنے کا ارادہ کیا تو
مری ماں بہت روئی تھی
اس کے ہر ایک کونے سے، طاقوں سے
ٹوٹی ہوئی سڑھیوں سے
اسے انتہا کی محبت تھی
مجبور ہو کے وہ بولی
یہ تنگی کے دن کٹ ہی جائیں گے آخر
یہ اک سائباں ہی تو باقی بچا ہے
اگر چھن گیا تو کہاں جائیں گے ہم

مکاں خیر بکنا تھا، سو بک گیا
اور قرضہ چکانے کی صورت جو کوئی نہیں تھی
ہم اپنے ہی گھر میں کرائے پہ رہنے لگے تھے
کسی روز بے دخلی کا حکم نامہ ملے گا
یہ دھڑکا بھی ہر دم لگا تھا
اداسی کے چہرے پہ ساری لکیریں سسکتی تھیں لیکن
کہانی مکمل نہیں تھی

شکستہ دریچے سے اوپر
جہاں بالے باہر کو نکلے ہوئے تھے
وہاں فاختاؤں کا جوڑا بھی رہتا تھا
آزادی سے آتا جاتا
مری ماں کی عادت تھی روٹی کا ٹکڑا بجا کر
انھیں ڈال دیتی
مکاں بکتے ہی فاختاؤں کا جوڑا اچانک
نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا
انھیں در بدر ہونے کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا
اداسی بلکتی تھی لیکن
کہانی مکمل نہیں تھی

طالب انصاری

وہ برسات کے دن تھے

جب پچھلے کمرے کی چھت گر گئی تھی

وہاں سے کہیں اور جانے کو

جی تو نہیں چاہتا تھا

مگر اب تو مالک مکاں بھی بضد تھا

نیا گھر پرانے سے بھی مختصر تھا

اور اس کے در و بام بھی اجنبی تھے

اداسی کی آنکھوں میں جالے اترنے لگے

اور کہانی مکمل نہیں تھی

نئے گھر میں رہتے

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے

وہی فاختاؤں کا جوڑا

رسوئی کی چھت پر چہکنے لگا تو

اداسی کے لب پر ہنسی تھی

کہانی مکمل پرندوں نے کی تھی

نظم

میرا دھیان رکھ
میرے ساتھ رہ
مجھے دھڑکنوں میں
سجائے چل
مری سانس بن
میری آس بن
مجھے گود لے
مجھے لاڈ کر
مجھے اپنے آپ
میں ڈھال لے
مجھے دشتِ غم سے
نکال لے

امین کنجاہی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

دو پیسے کا ہُنر

[نثری نظم]

فضول خواب تھا
آنکھوں کے ذریعے
دل کی ریاست پہ قابض ہوا
اور میری ربع صدی کا توشہ
خاک کا ڈھیر بن کر
میرے قد سے اونچا دکھائی دینے لگا

فضول سی تعبیر تھی
مجھے صحرائی گھوڑے پر
بٹھا کر
خلا کی نامعلوم سمت کی جانب
نجانے کہاں لے گئی
یہ کسی تصوراتی سطح کا ذہنی خلل تھا
حقیقت تھی
واہمہ تھا

کسی نیک ساعت کی بدولت
دوبارہ زمین پر پاؤں رکھے
اور اپنی خستہ حالی کی سیلفی بنا کر
سوشل میڈیا پہ اپلوڈ کی

اب میرے کشکول میں
دو پیسے کا ہنر ہے
سوچتا ہوں
تجربے کا پتنگ بنکر
ہوا میں اڑاؤں
نئے سرے سے سفر
آغاز کروں
گوشہ نشینی کی خلوت کا مزا لوں
اپنی ناکام کہانی کو
اخبار میں چھپا کر جلا دوں
اپنی حماقت اور
بے وقوفی پہ
مقالہ لکھوا کر امر ہو جاؤں

امجد بابر

موت کا رنگ

چار موسم ہیں مگر
یہ جس کا موسم تو جیسے نقش ہو کے رہ گیا
زندگی کے ذائقے بھی کھا گیا

اب وہ حالت ہے
بیاں ممکن نہیں

دھیرے دھیرے
سانس لینے کی وہ پہلی سی سہولت بھی گئی
دیر سے گھر لوٹ کر آنے کی عادت بھی گئی
جھیل آنکھوں میں اتر جانے کی
خواہش بھی گئی
جو کبھی تجھ سے محبت تھی محبت بھی گئی

اب تو ایسے لگ رہا ہے
موت گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہے دم بدم

سات رنگوں میں فقط اک رنگ باقی رہ گیا
رنگ بھی پھر موت کا
جو اترتا ہی نہیں

اظہر عباس

دو گھڑی سانس کی قیمت

کل جو آئی ہی نہیں اُس کے لیے
کیا سے کیا سوچ رکھا تھا یونہی

سوچنے کو تو بہت کچھ تھا مگر
اک یہی بات نہیں سوچی گئی
دو گھڑی سانس کی قیمت کیا ہے
خاک میں ملنے سے کیا ہوتا ہے
سرخیاں چہروں کی جاتی ہیں کہاں
نیند آنکھوں سے بھلا کیسے ہوا ہوتی ہے
زندگی کتنے برس باقی ہے
کوئی اندازہ نہیں
یوں بھی اندازوں پہ چلتی ہے کہاں
سانس کی ڈور

طاق میں رکھے ہوئے
برسوں پرانے سپنے
ایسے بوسیدہ کہ چھونے سے
بکھر جاتے تھے

اس لیے اور نئے سپنے لیے
دل امنگوں سے بھرا
تیری محبت کے نشے میں مخمور
کل جو آئی ہی نہیں اُس کے لیے
سر پہ منصوبوں کی گٹھڑی تھامے
کسی بچے کی طرح
لاپروا
اپنی مستی میں چلا جاتا تھا
پھر میری نگاہ
سبز پیڑوں سے یونہی ٹوٹتے پتوں پہ پڑی
جن کا یہ جرم کہ ہلدی کی طرح زرد تھے وہ
جھرجھری لے کے بدن کانپ گیا
سر سے منصوبوں کی گٹھڑی بھی
کہیں جا کے گری

اور اندازہ ہوا
خاک میں کیسے بھلا خاک ہوا جاتا ہے
دو گھڑی سانس کی قیمت کیا ہے

اظہر عباس

نظم ساتھ دیتی ہے

بارشیں نہ آئیں تو
پیڑ سوکھ جائیں تو
کھیتیاں نہ بچتی ہوں
کھیتیاں بچانی ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

رات کی روانی میں
خوف ناک پانی میں
کشتیاں نہ چلتی ہوں
کشتیاں چلانی ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

جنگ کرنے والوں سے
بستیاں اجڑ جائیں
بستیاں نہ بستی ہوں
بستیاں بسانی ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

دوستوں کی آپس میں
چھوٹی موٹی رنجش ہو
دوریاں نہ مٹتی ہوں
دوریاں مٹانی ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

کیکروں کی چھاؤں میں
روٹیاں پکانی ہوں
لکڑیاں نہ جلتی ہوں
لکڑیاں جلانی ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

نظم ایک وعدہ ہے
عورتوں نے چوٹی سے
جس کو گس کے باندھا ہے
نظم اک تعلق ہے
میں جسے نبھاتا ہوں
جھونپڑی کو آندھی اور
آگ سے بچاتا ہوں
نظم ساتھ دیتی ہے

فیصل ہاشمی

محبت قرض ہے تم پر

محبت قرض ہے تم پر

مری آنکھوں کی ٹھنڈک تھے
جو سپنے ساتھ دیکھے تھے
سفر سارا
خرد کی آب شاروں سے
جنوں کے سب جزیروں تک
مکمل تھا
ستارے جھک کے چلتے تھے
مری چاہت کی حرمت سے
فضا ساری معطر تھی
دفورِ عشق میں ہر شب
تمھاری دید ہوتی تھی
نہ جانے کس گھڑی تم نے
جدا ہونے کی ٹھانی تھی
نہیں تھی گر خطا کوئی
تو کیسی بدگمانی تھی
جو تم منزل کے اتنا پاس
آ کے ڈر گئے ہم دم
محبت قرض ہے تم پر
اسے تم ہی چکاؤ گے
تمھارا ہی تو کہنا تھا
تمھاری ہی تو باتیں تھیں
جو سپنے ساتھ دیکھے تھے
وہ کیا پورے نہیں ہوں گے؟
وہ بس دعویٰ محبت کا
وہ سب باتیں نبھانے کی
وہ کیا رسمی سی باتیں تھیں
وہ دل رکھنے کی باتیں تھیں
یہی سچ ہے
یہی سچ ہے کہ اب سپنوں کی
ساری کرچیاں مل کر
مری آنکھوں میں اتری ہیں

رخسانہ سمن

وقت

پھر رات کی سیاہی کہیں خود ہی جل بجھی
پھر جھانکنے لگی تھی دریچوں سے چاندنی

پھر سے طیور جیسے بجاتے ہیں جلترنگ
پھر سائیں سائیں کرتی ہوئی رات سوگئی

کُو کو کی وہ صدا بھی کہیں دور کھو گئی
پھر یوں لگا کہ جیسے ابھی صبح ہو گئی

لیکن یہ ثانیہ بھی نظر کا سراب تھا
یہ خواب بھی تو جاگتی آنکھوں کا خواب تھا

خالی تھا گو فلک کا ابھی داغ داغ سے ایاغ
لیکن کہیں نہیں تھا کوئی چاند کا سراغ

راجہ عبدالقیوم

اماں

تمہارا چھوڑ کے جانے کا لمحہ
سزائے موت کا اعلاں تھا اماں
گلے میں لفظ گھٹ کر رہ گئے تھے
جھڑی اشکوں کی جاری ہوگئی تھی
میں دفتر میں جہاں بیٹھا ہوا تھا
اُسی ٹیبل پہ اپنا سر جھکا کر
تمہاری موت پہ نوحہ کناں تھا
مرے کانوں میں بھائی کی سسکتی
تڑپتی اور بلکتی آہ بھرتی
وہی آواز پیہم گونجتی تھی
کہ وہ ہم سے جدا ہو کر چلی ہیں
کہ بھائی آج سے امی نہیں ہیں

کاظم حسین

اک ناؤ ہے

اک دریا ہے!
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
آکاش پہ سورج چاہت کا
جذبوں کا تیز بہاؤ ہے
بچپن کی یاد کے پنچھی نے
دل نگری پنکھ بچھائے ہیں
اک شوق سمندر لہروں میں
کرنوں کا کہیں پڑاؤ ہے
اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک دنیا ہے!
دنیا کے پھیلے میلے میں
جیون کے سخت جھمیلے میں
ناؤ طوفان کی زد پر ہے
پانی میں شور سا اُٹھنے پر
یہ موج بھی رستہ بھول گئی
تتلی کا نٹوں پر جھول گئی
ماضی کی یاد کی خنک ہوا
اب بھی اس ساحل رکتی ہے
ریتیلا جدھر کٹاؤ ہے

اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک تتلی ہے!
تتلی کی نرم سی خواہش ہے
خواہش نے باغ کی شاخوں میں
چپکے سے ڈیرا ڈالا ہے
بچپن کی یاد کے پنچھی کو
خود وقت نے پیار سے پالا ہے
اک ان دیکھی منزل ہر پل
اس رنگ کو چھونے نکلی ہے
جسے لہروں نے دھوڈالا ہے
سب مدوجزر ہے لمحوں کا
سب وقت کا بیچ اور داؤ ہے

اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک لمحہ ہے!
جسے وقت اڑائے جاتا ہے
اک لمحہ خواہش کا لمحہ
اک لمحہ زخم ہے گھاؤ ہے
اک لمحہ پلک کنارے پر
اک لمحہ وقت کے دھارے پر
لمحوں کے انھیں جزیروں میں
گرداب، کہیں کٹاؤ ہے
اک ناؤ ہے
اے خالق، مالک
میرے خدا
یہ تند ہوا
یہ وقت کے دھارے اور دریا
سب تیرے ہیں
لیکن یہ ایک بھٹکتی تتلی کس کی ہے
دریا کے بیچ یہ ناؤ جو ہے یہ کس کی ہے

رخشندہ نوید

خطوط

نوٹ: (مرحوم) پروفیسر جلیل نقوی ایم او کالج میں جناب امجد اسلام امجد اور جناب عطاالحق قاسمی کے کولیگ تھے۔

(مرحوم) پروفیسر جلیل نقوی کے نام

ابا جی! میرے پیارے ابا جی، السلام علیکم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور نئی جگہ پر اب تک سیٹل ہو گئے ہوں گے آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا دل بہت غم زدہ ہے آپ کے جانے کے بعد، آپ مجھے بہت زیادہ یاد آتے ہیں، بہت زیادہ یاد آتے ہیں، بہت زیادہ، مگر ایک بات ہے جو دل کو ڈھارس دیتی ہے کہ اب آپ اس دکھوں کی دنیا سے دور کسی بہت اچھی جگہ پہ موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اتنے خوش ہوں گے کہ اب دنیا کے سارے دکھ بھول گئے ہوں گے۔

پتہ نہیں آپ مجھے یاد کرتے ہیں یا نہیں ایسا ہو نہیں سکتا کہ آپ مجھے یاد نہ کرتے ہو آپ تو بہت پیار کرتے تھے مجھ سے، مجھ سے ہی کیا آپ کو تو سب سے ہی محبت تھی سراپا محبت تھے، آپ جیسے انسان تو بلا غرض پیار کرتے ہیں پہلے میں سمجھتی تھی کی ایک طرح کی محبت دوسری محبت کا خلا پُر کر سکتی ہے مگر اب یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی محبت اور شفقت کا خلا کبھی پُر نہیں ہو سکے گا، مجھے اور آپ کے تمام پیار کرنے والوں کو اس خلا کے ساتھ ہی جینا پڑے گا۔ جب تک زندگی ہے مگر ہاں ایک بات اچھی ضرور ہوئی کہ ایک امید ہے کہ ایک دن تو آپ سے ملاقات ضرور ہو گی ان شاء اللہ اور اس سے بہت بہتر جگہ پر ہو گی ان شاء اللہ بس اب صرف یہی کوشش اور دکھ ہے کہ اس قابل ہو کہ آپ سے میں مل سکوں۔ ہو جاؤں گی نا؟ ابا جی آپ تو میری ساری الجھنیں سلجھا دیتے تھے، میرے سارے الٹے الٹے سوالوں کے جواب دیا کرتے تھے مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو آپ سکول لینے کے لیے آتے ہیں پھر دوسرے بہن بھائیوں کا انتظار کرتے ہوئے میں آپ کے اردگرد دوڑ کر کھیلتی رہتی تھی چکر لگاتی رہتی تھی آپ کے اردگرد اور آپ بھی مجھے اپنے ہاتھ پکڑاتے رہتے تھے یاد ہے مجھے اب تک ایک دن آپ نے مجھے سکول ڈراپ کیا اندر جا کر پتہ چلا کہ سکول میں تو چھٹی ہے تو میں آہستہ آہستہ چلتی خود ہی کالج کے گیٹ تک پہنچ گئی جہاں آپ پڑھایا کرتے تھے وہ بھی کیا دن تھے اکیلی بچی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سال کی اکیلی چلتی جا رہی ہے سڑک کے کنارے اور کوئی خطرہ نہیں، کم از کم انسانوں سے، مجھے یاد ہے کہ جب آپ آئے تھے تو میں گارڈ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور آپ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے وہ بھی مجھے یاد ہے، شاید اس لمحے آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا ہو گا کہ میں خیریت سے وہاں موجود تھی۔

اور کیا کیا باتیں یاد کروں میرا تو سارا بچپن لڑکپن جوانی اور اس کے بعد کی ساری زندگی آپ کی یادوں سے بھری ہوئی ہے۔ زندگی کا ہر قدم آپ کی شفقت اور رہنمائی کے سہارے طے ہوا ہے میں تو اپنی باقی تمام زندگی آپ کو یاد کرتی رہوں تو شاید میری بقیہ زندگی گزر جائے اور یہ صرف میں ہی نہیں اور بھی بہت لوگ ہیں گھر میں اور گھر سے باہر جو اسی طرح کے جذبات رکھتے ہیں جن کی زندگی میں آپ نے اپنی محبت بھری شخصیت سے دوررس اثرات مرتب کیے ہیں مگر ابا جی کبھی سوچا تھا کہ آپ کے جانے کے بعد کیا بنے گا۔ ان سب کا جو آپ کی شفقت سے مستفید ہو رہے ہیں؟ آپ کو معلوم تھا نہ کہ یہ دنیا بہت مشکل جگہ ہے اور وہ سب لوگ جن کے لیے آپ کی شخصیت ایک سایہ دار درخت کی مانند تھی وہ تو تپتے سورج تلے آ جائیں گے۔ یکا یک طوفانوں، سیلابوں، اور بجلیوں سے بچانے والا میرا سائبان باقی نہیں رہا۔ جب آپ میرے پاس نہیں ہوتے تھے تو آپ کی دعاؤں کا حصار محسوس ہوتا تھا، مگر اب وہ دعا میں اُٹھے ہوئے ہاتھ اس دنیا میں نہیں رہے، اب باقی زندگی کس طرح گزرے گی ان کے بغیر؟ ابا جی جب بھی میں لکھنے لگتی ہوں کوئی نہ کوئی کام پڑ جاتا ہے اور میری سوچوں کا بہاؤ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب تک زندگی ہے یہ دنیا کے جھمیلے ختم نہیں ہوتے۔ آپ تو ان سب سے آزاد ہو گئے ہیں نا۔

عرصے میں ہوں گے اب۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ ان جھمیلوں میں آپ نے بھی کتنی جدوجہد کی ہے، ہم سب سے کہیں زیادہ۔ مگر میں نے آپ کو کبھی ایک دفعہ بھی شکوہ کرتے نہیں دیکھا، نہ حالات کا، نہ کسی اور چیز کا، بلکہ آپ تو اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا کسی برے تجربے کے بعد اس سے سیکھنا اس طرح سے چاہیے کہ انسان معاف کر دے دوسروں کو، مگر تجربے کو یاد رکھیں۔ آپ کو پتہ ہے نہ کہ آپ کی بیماری کا عرصہ کس قدر مشکل تھا، آپ کی زندگی مختلف قسم کی جدوجہد سے عبارت تو تھی ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ بیماریوں سے بھی نبرد آزما ہوتے رہے ہیں، دل کی بیماری، اور ضعیفی وغیرہ۔ آپ کو تھوڑا سا بھی درد ہوتا تھا اور اس سے جیسے سانس بھی لوگوں کا رک جاتا تھا۔ ابا جی واقعی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا آپ کے دل کے آپریشن کی روداد بہت بار لکھنا چاہی مگر نہ حوصلہ پڑا اور نہ ہی آنسوؤں نے اجازت دی۔ میرا دل آپ کے بارے میں ہمیشہ بہت حساس تھا، بالکل ایسے ہی جیسے آپ کا ہمارے لیے تھا آپ کے آپریشن کے دوران گزارے گئے دن زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ آپ تو ان تکلیفوں سے دور ہو گئے ہیں نا۔ میں نے سنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی غم، تکلیف اور رنج نہیں ہے اب تک تو آپ ان لوگوں سے بھی مل چکے ہوں گے جن کو آپ بہت یاد کرتے تھے جو آپ سے بچھڑ گئے تھے جیسے آپ ہم سے بچھڑ گئے ہیں۔ ابا جی اب مجھے اب سمجھ آئی کہ آپ کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ جب دادی جان اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ آپ کے بہت پیار کرنے والے بڑے بھائی اچانک ایک حادثے کا شکار ہو گئے وہ تمام لوگ جو آپ کا خیال رکھتے تھے۔ کتنی جلدی آپ کو چھوڑ گئے اور بس ہم جیسے آپ کے ساتھی رہ گئے جن کا آپ کو خیال رکھنا تھا مگر اس تمام کے باوجود کبھی ہمارے سامنے کمزور نہیں پڑے۔ تاکہ ہمارے حوصلے برقرار رہیں۔ اتنا ثبات مجھ میں تو نہیں ہے۔ جہاں آپ کا ذکر آتا ہے آنسو سارے بند توڑ کر ایسے بہنے لگے ہیں جیسے بس اسی انتظار میں ہوں، ہمیشہ آپ سے اسی دعا کی درخواست کرتی تھی۔ آپ میرے لیے اللہ سے استقامت بھی مانگ دیجیے پلیز۔

اچھا چلیں اس ذکر کو چھوڑتے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جانے کے بعد ہم آپ کی لکھی ہوئی نعت "میری جانب بھی ہو اک نگاہِ کرم" بار بار سنتے رہے ہیں۔ ام حبیبہ نے اس نعت کو واقعی بہت خوبی سے پڑھا ہے اب تو انٹرنیٹ پر بھی بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔ تو ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ وہ پچھلے چالیس سال سے مختلف مواقع پر اس نعت کو پڑھتی رہی ہیں۔ آپ کی مختلف تحریریں، نظمیں، نعتیں، مضامین وغیرہ مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ میں نے جب پرانے رسائل اور کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے کافی چھوٹی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اتنی بڑی لائبریری ہے آپ کی۔ اس میں ہزاروں کتابیں ہیں، پھر آپ نے کتابیں لکھیں بھی۔ 'تاریخ بروالہ سیداں' جس میں ہجرت کی روداد اور ہمارے آبائی علاقے (انڈیا) کے بارے میں ساری تفصیلات درج ہیں۔ یہ اس علاقے کے بارے میں واحد کتاب ہے اسی وجہ سے تحقیقی سطح پر بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ آپ کو یہ سب کام کرنے کا وقت کیسے ملتا تھا میں تو جب بھی آپ کو دیکھتی تھی، آپ گھر یا بچوں کے کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتے تھے مجھے بچوں کو سکول سے لانا، اور لے جانا، گھر کا سودا سلف لانا، مرمت طلب چیزوں کی مرمت کرنا، گھر کے کاموں میں امی کی مدد کرنا، نوکری پر جانا، بچوں کے چھوٹے سے چھوٹے کام بھی خود کرنا، لوگوں سے ملنا ملانا، باقاعدگی سے نماز مسجد میں ادا کرنا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹی تھی تو پیاس لگنے پر رات کو اٹھ جاتی تھی اور زور سے آواز دیتی تھی۔ پانی۔ اور آپ اپنی نیند سے اٹھ کر مجھے پانی کا گلاس لا کر دیتے تھے۔ پھر بھی ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تھا، تو اس کو ڈاکٹر کے لے جانا اور پھر ساری تیمارداری بھی خود کرنا۔ دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے تو وہاں گھنٹوں ہمارے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرتے تھے ہوا ڈاکٹر کو ساری تفصیل بتاتے تھے۔ وہ تمام کام جو آپ کرتے تھے میری سوچیں ان کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور یہ تمام کام آپ ماتھے پر ایک شکن بھی لائے بغیر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے بے شمار علمی کام بھی کیے۔ نہ جانے کیسے؟ ہاں مگر ایک بات مجھے یاد ہے کہ آپ اپنے روزمرہ کے معاملات کے بہت پابند تھے۔ صبح اٹھنے کا وقت، سونے کا وقت، کھانے کے اوقات، بالکل مقرر تھے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ایک لقمہ بھی مزید نہیں لیتے تھے۔ کھانے کی جگہ سے اٹھ گئے تو بس مزید نہیں۔ کھانے کے اوقات کے علاوہ اور کچھ نہیں کھاتے تھے۔ اسی طرح سونے جاگنے کے اوقات بھی مقرر تھے۔ اس معمول میں میں نے کبھی ناغہ نہیں دیکھا۔ اتنا ڈسپلن اور نظم وضبط اپنی ذاتی زندگی میں آپ نے اپنا رکھا تھا مگر اس وقت مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا مجھے یوں لگتا تھا کہ شاید سب کے والد ہی ایسے کرتے ہوں گے مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تو معلوم ہوا کہ سب کے والد ایسے نہیں ہوتے۔ مگر لیے تو والد ایک شجر سایہ دار کا تصور تھا۔ کیوں کہ میں نے آپ کو والد کے روپ میں دیکھا تھا ایسے والد، جنھوں نے مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ میرے ذہن کو ان تمام بندھنوں سے آزاد رکھا، جس میں عام طور پر ہمارے معاشرے میں خواتین قید ہوتی ہیں۔ آپ کے ذہن میں واقعی بیٹے اور بیٹی کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی اور اس کا اظہار ساری عمر آپ نے عملی طور پر کیا۔ اور یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ آج آپ کی تمام اولاد بیٹیوں سمیت اپنے پیروں پر کھڑی ہیں اور اپنے اپنے شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہے۔ میں نے کبھی آپ کی زبانی یہ نہیں سنا کہ بیٹیوں کو پڑھ لکھ کر کچھ بننا چاہیے۔ اور بیٹیوں کو صرف شادی کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ آپ نے ہمیشہ کہا کہ آپ کی خواہش ہے کہ تمام اولاد خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، اپنی

صلاحیتوں کو استعمال کرے اور کچھ بن کر دکھائے۔ یہ سوچ کا حامل تھا۔ پھر کیسے یہ مختلف سوچ آپ کے ذہن میں پروان چڑھی؟ میں نے ایک دفعہ آپ سے یہ سوال پوچھا تھا تو آپ نے مجھے بتایا تھا کہ شروع سے آپ نے اپنے خاندان میں بھی دیکھا ہے کہ عورتوں کا تعلیم اور دوسرے حقوق کے بارے میں استحصال کیا جاتا ہے۔ انھیں تعلیم اور دیگر چیزوں میں جان بوجھ کر پیچھے رکھا جاتا تھا۔ تا کہ وہ ہمیشہ خاندان کے مردوں کی ہی محتاج رہیں اپنی ضروریات کے لیے۔ اور اسی صورت حال نے آپ کے ذہن میں یہ سوچ پیدا کی کہ آپ اپنی بیٹیوں کو کبھی محتاج نہیں ہونے دیں گے اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلائیں گے اور پھر آپ نے یہی کیا۔ بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ انھیں پڑھنے کے اور دنیا میں آگے بڑھنے کے مواقع دیے مگر اباجی! پاؤں پر تو ہم لوگ کھڑے ہو گئے، ایک مقام بنا لیا مگر ہمیشہ جب بھی ہم میں سے کسی بہن بھائی کو کوئی مرحلہ درپیش ہوتا تھا خواہ خانگی زندگی سے متعلق ہو یا تعلیم اور ملازمت کے بارے میں ہو، پہلا خیال یہی آتا تھا کہ آپ سے بات کر کے مشورہ حاصل کیا جائے پھر آپ سے بات کر کے ایسا اطمینان نصیب ہوتا تھا جیسے کہ سارے مسائل حل ہو گئے ہوں اور واقعی مسائل حل ہو بھی جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے کوئی بھی امداد پیدا فرما دیتے تھے، مگر اب یہ سب کیسے ہوگا اباجی! زندگی کے مراحل تو تو اب بھی باقی ہیں۔ ان میں کس سے مشورہ لیں گے ہم؟ کس سے کہیں گے کہ اباجی ایسی دعا کر دیں اور آپ کہتے تھے گھبرائیں نہیں بیٹا۔ حوصلہ رکھیں اللہ فضل و کرم کرے گا ان شاء اللہ اور یہ صرف ہم بہن بھائی ہی نہیں، میں دیکھتی تھی کہ ہمارے خاندان کے بہت سے افراد، محلے کے لوگ، دوست احباب آپ سے خاص طور پر ملنے اسی لیے آتے تھے۔ تا کہ آپ سے مسائل بیان کر سکیں اور آپ کی رائے لیں۔ آپ اسی توجہ اور شفقت سے ان کی باتیں بھی سنتے تھے۔ مشورے بھی دیتے تھے اور دعا کرتے تھے۔ شاید ایسی ہی شخصیت کو ہمہ گیر شخصیت کہا جاتا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت انمول تھی۔ ایک ایسا بہتا ہوا فیض کا چشمہ جس سے ہر کوئی سیراب ہوتا تھا۔ میں کئی بار سوچتی ہوں کہ جو لوگ اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی کے مطابق ڈھال دیتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں سرشار ہوتے ہیں، تو ان کی شخصیت میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے، جو ان کے اردگرد موجود ہر ایک کو متاثر کرتی ہے۔ اور ہر شخص کو ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ اباجی! زندگی تو ابھی باقی ہے اور آپ نے اتنی محبت دی کہ اب اس کے بغیر جینا مشکل لگتا ہے۔ مگر محبت بانٹنا تو ایسا کام تھا شاید جس کے بغیر آپ کا گزارا بھی نہیں تھا اور محبت بھی ایسی کے بغیر کسی شرائط کے۔ بے غرض اور بے لوث۔ حتیٰ کہ کبھی اپنی اولاد سے بھی بدلے کی توقع نہیں رکھی۔ آخری دنوں میں جب بیماری کی وجہ سے ایسے مواقع بھی آئے، جب آپ کو مدد کی ضرورت پڑی بھی، تب بھی جہاں تک ممکن ہو سکا کسی کو زیر بار نہیں کیا۔ حرکت کرنے میں مشکل ہوتی تھی مگر اپنے تئیں انتہائی کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح خود ہی اٹھ جائیں۔ حتی الامکان کوشش کرتے تھے۔ کہ کسی کو مدد کے لیے بلانا ہی نہ پڑے۔ آخری کچھ سالوں میں آپ بہت بیمار بھی رہے، مگر اس میں ایک لفظ شکایت کا منہ سے نہیں نکلا۔ گلاس پر گرفت کمزور ہو رہی ہے۔ ہاتھ کانپ رہا ہے۔ مگر جب تک ہمت ہوتی، تب تک خود ہی پکڑے رکھنا ہے اور ہونٹوں تک لے جانا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے چھوٹے کاموں کے لیے بھی کسی کو زیر بار کرنا آپ کو گوارا نہیں تھا۔ اسی لیے ہمیں آپ کی فکر بہت زیادہ ہوتی تھی۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ضرورت پڑنے کے باوجود آپ کی کوشش یہی ہوگی کہ کسی سے کوئی کام نہ کہنا پڑے۔ آپ واقعی ایک بے لوث انسان تھے۔ کبھی کبھار میں یہ خبریں سنتی ہوں کہ فلاں کے ماں باپ اس سے ناراض ہیں۔ کہ وہ لوگ ان کی توقعات کے مطابق ان کا خیال نہیں رکھ پائے۔ تو حیرانی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے لیے تو آپ نے کبھی بھی کسی قسم کی توقع کسی سے بھی نہیں رکھی۔ سوائے خالق کائنات کے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نفس مطمئنہ سے سرفراز تھے۔ ہمیشہ ہمیں اپنی دعاؤں سے مالا مال رکھا۔ ہمیشہ دینے والا ہاتھ ہی رہا آپ کا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ اللہ کو دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے زیادہ پسند ہیں۔ اباجی! ابھی حال ہی میں نماز اور وضو کے حوالے سے کچھ کتابیں اور انٹرنیٹ پر کچھ معلومات دیکھ رہی تھی، تو مجھے یاد آ رہا تھا کہ آپ نماز کے کس قدر پابند تھے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا نماز پنجگانہ مسجد میں جا کر ادا کرتے تھے مگر ایک خاص بات وہ مجھے یاد آتی ہے کہ جس طرح آپ قیام میں کھڑے ہوتے تھے، سجدہ میں جاتے تھے۔ دعا مانگتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے آپ کا پورا وجود عاجزی میں ڈوبا ہوا ہے۔ دعا مانگتے ہوئے آپ کو دیکھتی تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود ہیں اور آپ سراپا عاجزی اور سراپا دعا ہیں۔ پتا نہیں آپ کیا دعائیں مانگتے تھے۔ کیا راز و نیاز اپنے مالک سے کرتے تھے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ میں اور وہ تمام لوگ جن سے آپ محبت کرتے تھے۔ وہ ان دعاؤں میں ضرور ہوتے ہوں گے۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ان دعاؤں کے ہی ثمرات ہیں جو ہم سب سمیٹ رہے ہیں۔ اس میں ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں۔ میرے بہت زیادہ باعمل نہ ہونے کے باوجود کبھی بھی آپ مجھ سے ناامید نہیں ہوئے۔ جب بھی موقع ہوتا تو بہت نرمی سے نصیحت کرتے، بیٹا نماز پڑھا کریں۔ جب میں آخری بار آپ سے ملنے گئی تو خاص طور پر تفہیم القرآن کی تمام جلدیں منگوائیں اور مجھے تحفتاً دیں۔ میں نے کہا بھی کہ میں خود خرید لیتی ہوں یہ جلدیں۔ مگر آپ نے خاص ہدایت کی کہ تفہیم القرآن کی یہ جلدیں آپ کی طرف سے مجھے خرید کر دی جائیں۔ بیماری نے اجازت نہیں دی ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ خود جا کر خرید کر لاتے اور مجھے دیتے۔ اباجی! یہ آپ کا میرے لیے آخری تحفہ تھا۔ اور وہ میری آپ سے آخری ملاقات تھی۔ کاش کہ مجھے معلوم ہوتا ...... وہ تفسیر میں نے اس وقت بھی پڑھنی شروع نہیں کی تھی۔ مصروفیتیں بے تحاشا تھی

خاص توجہ بھی نہیں دی مگر اب جب سے آپ گئے ہیں نماز بھی باقاعدگی سے ادا کرتی ہوں اور تفسیر کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے۔ پہلے تو آپ کو نا امیدی کی عادت ہی نہیں تھی اور دوسری بات یہ کہ آپ کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر آپ کی نصیحت ضرور اثر کرے گی۔ میری زندگی میں اگر مجھ سے کوئی نیکی کا کام سرزد ہوتا ہے تو وہ آپ کی وجہ سے ہے ابا جی! اور وہ جو غلطیاں میں نے کی وہ میری اپنی کوتاہیاں ہیں اور یہ آپ کا دیا ہوا حوصلہ ہی ہے کہ زندگی میں قدم آگے بڑھا سکی ہوں۔ دین کی فہم بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں گی ابا جی۔ کیوں کہ یہ آپ کی خواہش تھی اور آپ کو مجھ پر ابھی تک یقین تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رمضان کے شروع ہونے سے پہلے آپ خاص طور پر اس کی تیاری کرتے تھے۔ اتنے خوش ہوتے۔ جیسے ہم کسی خوبصورت مقام کی سیر پر جانے سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ بڑے اہتمام سے روزے رکھتے۔ سحری کے بعد Excited کا وقت تلاوت اور پڑھائی کے لیے مخصوص ہوتا۔ تلاوت کرنا تو آپ کا روزمرہ کا معمول تھا مگر رمضان کے دنوں میں خاص اہتمام سے کرتے۔ پھر اسی انہماک سے معمولات میں مصروف ہو جاتے۔ افطاری کے وقت مسجد میں کھانے پینے کی اشیاء لے کر جاتے۔ رات کو تراویح پڑھتے۔ عید کے دن اسی طرح خوش ہوتے جیسے بچے خوش ہوتے ہیں۔ عید کی نماز کے بعد سب سے گلے ملتے۔ شوق سے سویاں کھاتے۔ لوگوں سے ملنے جاتے۔ جن دوستوں سے کافی عرصہ ملاقات نہ ہوتی ان کو خاص طور پر فون کرتے۔ حال چال پوچھتے اور عید کی مبارک باد دیتے۔

ابا جی! ساری زندگی میں نے آپ کو اپنی ذات کے لیے کچھ خریدتے نہیں دیکھا سوائے کتابوں کے۔ آپ کے کپڑے بھی امی خرید کر لاتیں۔ ورنہ آپ کے پاس گن کر کچھ جوڑے کپڑے کے ہوتے اور جب زیادہ ہو جاتے تو خاموشی سے کسی کو دے دیتے۔ مگر کتابوں پر آپ دل کھول کر خرچ کرتے۔ جب کتابیں خریدنے لگتے تو جتنی رقم پاس ہوتی۔ وہ تمام ختم ہو جاتی مگر پھر بھی کچھ کتابیں ایسی رہ جاتی جو آپ نے خریدنی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جس طرح ہم کپڑوں کی خریداری کے بعد گھر آ کر بڑے اہتمام کے ساتھ آئینے کے سامنے پہن پہن کر دیکھتے ہیں۔ آپ اپنی تمام کتابیں گھر کی دوسری منزل پر واقع اپنی لائبریری میں لے جاتے۔ تمام کتابوں کو سیٹ کرتے اور ایک کے بعد دوسری کا مطالعہ کرنے بیٹھ جاتے کتابوں کے علاوہ آپ کو کرکٹ کا بھی شوق تھا۔ کرکٹ کے میچ باقاعدگی سے دیکھتے۔ خاص طور پر انڈیا اور پاکستان کا۔ ان دنوں جب میں اسلام آباد میں تھی تو انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک میچ ہوا۔ جو پاکستان کی ٹیم برے طریقے سے ہار گئی اور کوئی پانچ کیچ بھی ڈراپ کیے۔ آپ سے فون پر بات کرتے ہوئے ویسے ہی میں نے ذکر کر دیا کہ ہاں وہ میچ بھی ہم ہار گئے تو بس جیسے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پتہ چلا کہ آپ کو تو اچھا خاصا غصہ آیا ہوا تھا پاکستانی ٹیم پر۔ پانچ کیچ ڈراپ کر دیے ایسے کوئی جیتنے والے حالات ہوتے ہیں! بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی۔ آپ کو تو کبھی غصہ آتا ہی نہیں تھا مگر پاکستان سے محبت بھی تو بے تحاشا تھا۔ بچپن میں خاص طور پر چودہ اگست کو ہمیں سبز ہلالی جھنڈیاں لا کر دیتے تھے۔ تاکہ ہم گھر کو سجا لیں۔ 14 اگست کی صبح اٹھ کر گھر کی چھت پر سبز ہلالی پرچم لہرا دیتے۔ اور مغرب کے وقت اتار دیتے۔ ہمیں قائد اعظم کے واقعات سناتے۔ اقبال کی شاعری پڑھاتے۔ اور اس سب کی وجہ سے پاکستان کی محبت ہمارے دلوں میں راسخ کر دی۔

پاکستان کے قیام کے بعد اپنے خاندان کی ہجرت کا واقعہ بھی تفصیل سے آپ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے ابا جی کل آپ کو ہم سے بچھڑے ہوئے ایک مہینہ مکمل ہو جائے گا۔ یقین نہیں آتا کہ آپ چلے گئے ہیں اور اتنے دن بھی گزر گئے ہیں اور کار جہان ویسا ہی دراز ہے۔ پچھلے ہفتے میں سیر کے لیے باہر نکلی تو ساری فضا، دوڑتے بھاگتے لوگ، سرسبز درخت، دریا کی لہریں سب کچھ اجنبی سا دکھائی دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے محور سے جدا ہو کر خلا میں کہیں دور معلق ہوں اور نہ جانے کب ہوا کا اگلا تھپیڑا مجھے اڑا کر کہیں اور لے جائے۔ کبھی آپ نے وہ گیس کا غبارہ دیکھا ہے؟ کہ جب اس کا سرا کوئی مضبوطی سے پکڑ کر رکھے وہ اپنی جگہ پر جما رہتا ہے مگر جیسے ہی ہاتھ سے چھوٹتا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے رخ پر اڑتا نظروں سے غائب ہو جاتا ہے جہاں ہوا لے جاتی ہے وہیں کا رخ لیتا ہے۔ بس یوں لگتا ہے کہ میرا مرکز ثقل بھی ختم ہو گیا ہے۔ آپ موجود تھے تو ایک احساس تھا کہ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ایک مرکز ہے مگر اب جب فرصت اور پھر جیسے ہی زندگی سے اور غم روزگار سے فرصت ملتی تھی۔ دوڑ کر آپ کے پاس آ پہنچتی تھی مگر اب جب فرصت بھی ملے گی تو کیا ہوگا۔ وہ خوشی وہ انتظار تو اب نہیں ہوگا۔ کیا آپ کو بھی ایسا ہی احساس ہوتا تھا کہ ابا جی اپنے ماں باپ کے بچھڑنے کے بعد؟

پچھلے دنوں ایک لیکچر کے دوران سید سرفراز شاہ صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے نیک بندے اور ولی اللہ عام طور پر زندگی کے آخری حصے میں بیماری سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا ایک عام مشاہدے میں آیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اپنا خاص کرم اس بندے پر فرماتے ہیں اور اس نیک بندے کی جانے انجانے میں کی گئی غلطیاں معاف فرما دیتے ہیں۔ اور وہ بالکل پاک صاف، معصوم حالت میں اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضری دیتا ہے یہ سن کر میری ڈھارس بندھی اور دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ مجھے یقین ہے ابا جی کہ جب آپ اللہ کے حضور حاضری دے رہے ہوں گے، تو آپ کے دل میں

اطمینان ہوگا اور کوئی خوف اور غم آپ کے قریب نہیں ہوگا کیونکہ اللہ نے آپ کو نفس مطمئنہ کا انعام دیا تھا۔ اور آپ کا پاک صاف دل تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے سرشار تھا۔ اللہ آپ کو اس جہان کی بھی تمام تر نعمتوں سے مالا مال کرے۔ اعلیٰ مقام دے (آمین) اور ہمیں اس جہان میں آپ سے ملاقات نصیب کرے (آمین) میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک دعا کی تھی اور مجھے یقین ہے وہ ایک دن وہ پوری ہوگی۔ اور وہ دعا یہ تھی کہ جب میں دوبارہ اپنے والد سے ملوں تو ان کی جوانی کی حالت میں ملوں۔ اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ اور ان شاء اللہ ہاں امی اور آپ کے تمام چاہنے والے آپ سے دوبارہ ملیں گے کبھی نہ بچھڑنے کے لیے۔ ان شاء اللہ آپ نے تو بہت محنت کی زندگی کا امتحان پاس کرنے کے لیے مگر ہمارا امتحان تو ابھی بھی چل رہا ہے مگر وقت گزرنے میں آج کل زیادہ وقت نہیں لگتا۔ جلدی وہ وقت بھی آجائے گا جب اللہ کے حکم سے ہماری بھی حاضری ہوگی۔ ''کل نفس ذائقہ الموت'' اللہ آپ کو آخری آرام گاہ میں تمام راحتیں نصیب کرے اور اپنی رحمتوں کی بارش کرے (آمین) ثم آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

منزہ نقوی

آصف ثاقب

بہت ہی پیارے عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
بقول داغ بجز غم فراق سب خیریت ہے۔ نجیب احمد اور شفیق سلیمی کی جدائی کا صدمہ توڑ پھوڑ گیا۔ اس بڑھاپے میں جدائی کا صدمہ جھیلنا پڑا۔ مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم۔ خالد احمد اور نجیب احمد کی چہکتی لہکتی جوڑی لاہور کی شعری فضاؤں میں باجتی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا ان کا دلدادہ تھا۔ نجیب احمد سے ملاقات تو نہیں تھی 'بیاض' کے وسیلے سے دل بستگی تھی۔ 2009 اپریل میں میری کتاب ورکنار کی لاہور میں رونمائی ہوئی تھی اس تقریب میں انھیں دیکھا تھا۔ 'بیاض' کے مئی 2009 کے شمارے میں ورکنار سے انھوں نے کوئی نو شعر دیے تھے۔ اس تقریب میں نجیب احمد سے گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ نجیب احمد اور شفیق سلیمی سے 'بیاض' کے صفحات بارونق تھے۔ حق مغفرت کرے دونوں لاجواب شاعر تھے (نقل کر رہا ہیں) بالاکوٹ کے ہارون الرشید کی 'حاضری' سے اطمینان ہوا۔
انھوں نے مجھے یاد کیا۔ مہربانی ان کی۔ ہزارے کے اور احباب بھی 'بیاض' میں 'جلوہ آرا' ہوتے رہے ہیں۔ ہزارے کی طرف پیار کی نظر ڈالیں۔ طالب انصاری ہزارے ہی سے تصورات کی عمدگی لے کر آئے ہیں۔ وہ مانیں نہ مانیں ہم تو انھیں ہزارے کا مانتے ہیں۔ آفتاب احمد ملک نے توجہ کی میرے شعر اپنے خط میں لکھے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔
کتاب معمار ادب پاکستان مرتب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد بھیجتا ہوں۔

بشریٰ رحمن

عمران بھائی!
نعمان بھائی!
دعائے صحت و سلامتی و درازیٔ عمر۔ آمین
آج 'بیاض' کا تازہ شمارہ ملا۔
نجیب احمد کی تصویر دیکھ کر ویسا ہی دکھ ہوا جیسا میرے بھائی آصف کے جانے کا دکھ تھا۔
اب اس دکھ اور رنج کو بیان کرنے کے لیے الفاظ لاچار ہو گئے ہیں۔ کچھ دن پہلے بلقیس ریاض کے گھر ایک محفل میں نجیب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اسی طرح اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ بس وہ مجھے بڑے ادب سے سلام ہی کرتا تھا۔

کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ چپ رہتا تھا۔ سارے دکھ اپنی شاعری میں بیان کر دیتا تھا۔ اس روز بھی اس نے درد میں ڈوبی غزل سنائی تھی ___ کتنے ہی 'نجیب' کتنے ہی آصف اپنے دل کا دکھ بیان کیے بغیر چلے گئے۔'

اور اب ہمارے پاس اتنی سکت کہاں ہے کہ 'وچھوڑے' کا دکھ بیان کر سکیں۔ خالی خالی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتی ہوں۔

'ذہن رکھے ہیں سوال اس نے جواب 'روی رکھے ہوئے ہیں'' والسلام

جمیل یوسف

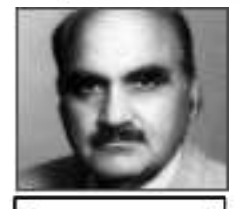

محبی عمران منظور صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ٹائٹل پر نجیب احمد اور شفیق سلیمی پر نظر پڑتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے نجیب احمد ہائے شفیق سلیمی۔ کہاں گئے وہ۔

ابھی پچھلے دنوں 'بیاض' کے شمارہ اپریل 21 میں ابدال بیلا کے مضمون میں پڑھا تھا۔

''وہ محفل پھر قہقہوں سے لت پت ہو جاتی۔ اس محفل میں سب سے سنجیدہ، صرف آنکھوں سے بولنے والا ایک ہی شاعر ہوتا۔ نجیب احمد۔

وہ باتیں کم کرتا

مگر دزدیدہ نگاہوں سے مگر کن انکھیوں سے دیکھا اپنے سے انداز سے ہر ایک کو دیکھا رہتا۔

مگر اُس کے دیکھنے میں کچھ ایسی طراری ہوتی کہ جس کو آنکھ بھر کے دیکھتا، اُسے پتہ چل جاتا، اُس کی نگہ نے اس کے کون سے چھپے زخم پر نمک پاشی کی ہے اور کون سی دکھتی رگ پہ اپنی نظر ڈالی ہے۔ دوسرے بھی نجیب احمد کی نگاہوں کی بولی کی ساری تفہیم سے آگاہ تھے۔ محفل میں پھر ہنسی کی کھڑکی کھل جاتی۔''

جناب ابدال بیلا نے اپنے جادو بھرے قلم سے نجیب احمد کی کیا ناقابل فراموش جھلک دکھائی ہے۔ ایک جھلک میں اُس کی پوری تصویر دکھا دی ہے۔

اور شفیق سلیمی۔ کیا باغ و بہار شخصیت تھا۔ جب پہلی دفعہ مجھ سے ملا تو اس نے بتایا کہ وہ جلیل عالی کا بڑا بھائی ہے۔ اس پہلی ملاقات میں اُس نے جلیل عالی کا ذکر کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ غائبانہ طور پر وہ مجھے جلیل عالی کے حوالے سے ہی جانتا تھا۔ میں نے اُس کے اس تیکھے جملے کے جواب میں یہ کہا تھا کہ شکر کرو غالب اور اقبال اب موجود نہیں ورنہ جلیل عالی اُن سے بھی یہی کہتا کہ میں آپ لوگوں کے بعد پیدا ہوا ہوں، مگر آپ سے بڑا شاعر ہوں۔

لیجیے میں اپنے پسندیدہ اشعار کے باب میں خالد احمد ہی کے اشعار نقل کرتا ہوں۔ سرورق الٹتے ہی خالد احمد کی خوبصورت غزل پر نظر پڑتی ہے۔ کیا شعر کہے ہیں:

اک قہقہہ کام کر گیا تھا — ہر شخص پہ چشم تر گیا تھا
وہ جسم سے روح میں اُتر کر — آہٹ کی طرح بکھر گیا تھا
وہ حشر بدوش، کوئے جاں سے — کیا چپ چپ گزر گیا تھا
اب تک نگراں ہے ذرہ ذرہ — وہ خاک بسر جدھر گیا تھا
ہر شخص تھا نوحہ گر کسی کا — جیتے جی کون مر گیا تھا
اک گھر سے اٹھا ہوا بگولا — بستی بستی بکھر گیا تھا

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اداس کر گیا تھا

آپ کا مخلص

محترم جناب نعمان منظور!

تسلیمات!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میں انتہائی شکر گزار ہوں کہ بیاض کے سلسلہ میں آپ کی کرم نوازی، میری کوتاہی اور عدم تعاون کے باوجود جاری وساری ہے۔

ہائے..... اللہ جنت نصیب کرے عاصم صدیقی کو کہ انہوں نے آپ سے ملوایا اور مجھے آپ کے طفیل لاہور کی اہم ادبی شخصیات

سے شرف باریابی حاصل ہوا۔ محترم نجیب احمد کے سانحہ ارتحال کا سن کر دلی صدمہ ہوا، میں جانتا ہوں ان کا غم آپ اور "بیاض فیملی" کے لئے کتنا گہرا ہوگا۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نجیب احمد، خالد احمد کے دوست اور دلدار تھے، آپ نے ہمیشہ اس تعلق کو بااحسن نبھایا۔ لاہور میں خالد احمد کے حلقہ میں نجیب احمد آخر تک ایک بزرگانہ شان کے ساتھ جلوہ گر رہے۔ اللہ انھیں بہشت میں بھی خالد احمد کا قرب نصیب فرمائے۔ آمین

اس ماہ کے بیاض کے سرورق پر ان کا عکس دیکھ کر الحمرا ادبی بیٹھک کی وہ بیٹھک یاد آگئی جو آپ نے میرے اعزاز میں سجائی تھی اور نجیب احمد نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔ ٹی ہاؤس اور انارکلی فوڈ اسٹریٹ میں آپ کی جانب سے دیئے گئے عشائے میں نجیب احمد سے ان کا کلام دیر تک سنا گیا جو آج بھی میری سماعتوں میں رچا بسا ہوا ہے۔

بیاض ہر ماہ باقاعدگی سے موصول ہوتا ہے لیکن گھر میں اس کے عشاق مجھ سے زیادہ ہیں۔ جب تک میری باری آتی ہے تب تک مہینہ پورا ہونے لگتا ہے اس لئے مطالعے کے بعد کچھ ارسال کرنا اگلے ماہ تک موخر ہو جاتا ہے۔ بس یہی کوتاہی میری شرمندگی کا باعث ہے۔ اللہ پاک آپ کو استقامت دے، آپ اسی طرح ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ آمین خیر خواہ

ملک غلام مصطفےٰ تبسم

رانا محمد شاہد

فنون لطیفہ سے وابستہ دو معروف شخصیات نجیب احمد اور شفیق سلیمی کی تصاویر دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہمارے ادب پر بھی ایک مشکل وقت چل رہا ہے کہ اسی مہینے میں پہلے کرن وقار، آصف فرخی اور قاضی جاوید رخصت ہوئے۔ پھر ہمارے ضلع بہاڑی سے تعلق رکھنے والے جدید لب ولہجے کے معروف شاعر فراش سید بھی کرونا کا شکار ہو کر دنیا سے چلے گئے۔

سید ریاض حسین مجاہد یزدانی، اسلام عظمی، اور ممتاز راشد نے نجیب احمد اور شفیق سلیمی کو خوب یاد کیا۔ میں نے اکثر جگہوں پر پڑھا کہ خالد احمد اور نجیب احمد نہ صرف صف اول کے شاعر تھے بلکہ جاں نثار دوست بھی تھے۔ ادبی دنیا کی مشہور ہونے والی جوڑیوں میں سے ایک خالد احمد اور نجیب احمد بھی تھے۔ ان کے انتہائی قریبی دوست بتاتے ہیں کہ وہ شروع سے ہی خاموش طبع تھے مگر خالد احمد کی وفات کے بعد زیادہ ہی خاموش ہو گئے تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے:

کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا	سمندر تک اچھلتا جا رہا ہے
نہ کچھ کہتا، نہ کچھ سنتا ہے کوئی	فقط پہلو بدلتا جا رہا ہے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ایک رہ ویراں ہم بھی ہیں مگر لگتے نہیں	دور تک سنسان ہم بھی ہیں مگر لگتے نہیں

شفیق سلیمی معروف شاعر جلیل عالی کے بھائی اور ہجرت کے موضوع پر پہلے پہلے شعر کہنے والوں میں سے تھے۔ ان کا یہ شعر پڑھا تو اندازہ ہوا کہ کیسے کیسے گوہر نایاب ہمیں چھوڑ گئے۔

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے	اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

بے نام دیاروں سے ہم لوگ بھی ہو آئے	کچھ درد تھے فن لائے کچھ اشک تھے رو آئے

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان بچھڑ جانے والوں کی روحوں کو آسودگی دے

خطوط میں ان سب احباب کا شکریہ خاص طور پر جمیل یوسف صاحب کا کہ انھوں نے لاہور پر لکھے میرے مضمون کو پسندیدگی کی سند دی۔

آفتاب احمد ملک

مکرمی و معظمی عمران منظور صاحب

ہدیہ سلام ورحمت!!

شمارہ مئی، جدید ادب، بیاض وقت مقررہ پر موصول ہوا- احسان مند ہوں- فرنٹ ٹائٹل پر برادرم نجیب احمد + شفیق سلیمی کی تصاویر دیکھ کر حیران ہوا- صفحہ نمبر 13 اور صفحہ نمبر 33 پر برادرم سید ریاض حسین زیدی صاحب کی تعزیتی دلخراش خبریں و مضمون پڑھ کر 45 سالہ دیرینہ یادوں کے غم میں ڈوب گیا- میجر غلام نبی اعوان بھائی، قلمی رفاقت لیے، ملتان کلر کہار اور راولپنڈی میں ان گنت ادبی و علمی مجالس میں مل بیٹھنا، خوددار و باغی قلم کار ضیاالحق کے مارشل لائی دور میں صرف علمی و ادبی موضوعات پر روزنامہ امروز + نوائے وقت میں 'جھروکہ' مستقل کالم لکھنے کی پاداش میں محکمانہ ترقی میں صرف 'میجر' رہا- نئی کتاب کی اشاعت کے بعد تبصرہ، مطالعے و ریکارڈز کے لیے اعزازی نسخہ بھیجنا 37 سالہ باہنامہ بھولتا تھا ملک کیا کیا ہمیں یاد آیا' (مطبوعہ 2016 صفحہ نمبر 55) پر راقم کی رائے بھی درج ہے- اختر نجیب احمد و میجر غلام نبی اعوان (مرحومین) پر الگ الگ تعزیتی مضامین تحریر کر رہا ہے- زیر نظر شمارہ کے (صفحہ نمبر 5-31) پر خفتگان خاک پر تعزیتی خاکے ادبی تاریخ کی مقتدر شخصیات کے بارے میں پڑھا-

سات افسانے حالات گزشتہ و حاضرہ کے عکاس ہیں- معاشرتی ناہمواریوں پر کڑی تنقید بھی ہے مثلاً انعام الحسن کاشمیری نے ''گلدان' کے حوالے سے افسانہ لکھا- قلم کار کی حساس طبیعت اور ہوم گورنمنٹ کی نفسیاتی سوچ کا تذکرہ کیا ہے-

تصوف کے عنوان سے سلیمان عبداللہ ڈار نے پاکستانی معاشرے کی بے چینی بلکہ خود ساختہ پیچیدہ مسائل کا حل آسان طریقہ بتایا ہے- حاصل اور محرومی- تجزیہ ہے- ہم سمجھ جائیں تو سنبھل سکتے ہیں-

اس بار شاہ داستان 10 صفحات پر مشتمل ہے- کمال کا حافظہ ہے، طنز و مزاح شاعری کے ساتھ وہاں کی تاریخ بھی قارئین کی دلچسپی کے لیے ساتھ ساتھ لکھتے ہیں بلکہ وطن عزیز اور دیگر ممالک کی تہذیب و ثقافت کا موازنہ بھی کرتے ہیں- سفرنامہ میں قطعاً بوریت نہیں ہے- طنز و مزاح پر دونوں مضامین سیدہ آمنہ ریاض صاحبہ + نورکمال شاہ صاحب نے اپنے اپنے مخصوص میں خوب لکھا ہے-

حمد و نعت، عقیدت میں سے روحانی و دینی واضح اشارات ہیں- وحدانیت اور رسالت پر خوبصورت کلام شعرا کی قلبی واردات کا غماز ہے- اندرونی ٹائٹل پر 8 نئی کتابوں کے ٹائٹل دیکھ کر بے پایاں ادبی و روحانی مسرت ہوئی- مصنفین شعرا و مبارکباد کے مستحق ہیں- غزلیات کے صفحہ نمبر 16-99) پر ہر غزل گو شاعر نے تخلیقی تشبیہات و استعارات سے، اپنی غزلیں لکھ کر کمال کر دکھایا ہے- بعض غزلیات میں نعتیہ اشعار بھی شامل ہیں- بعض دوستوں کی دو دو غزلیں شامل اشاعت ہیں یہ آپ کی اپنی پالیسی ہے ورنہ دیگر احباب کی دوسری غزل بھی شائع ہو سکتی ہے- 71 غزل گو شعرا کا کلام پڑھا بار بار پڑھا چند دوستوں کے اشعار نذر قارئین بیاض ہیں:

شعر محتاط قرینے سے پڑھے جائیں گے
بزم احباب میں کچھ پردہ نشیں ہوتے ہیں
ان کے ساز سے ثاقب عشق سوز والا ہے
دل کے ساز عاشق نے ، بانسری میں رکھے ہیں
(آصف ثاقب)

نسلیں جس میں ڈوب گئیں
کیسا وہ حل نشہ تھا
لفظ تھا کیا جو آدم نے
سب سے پہلے بولا تھا
(امجد اسلام امجد)

حسن کے سیلاب نے گھیرا ہے سارے شہر کو
ایک رستہ بھی نظر آتا نہیں بچتا ہوا
(جمیل یوسف)

اہیر و مفلس کے فرق سے بھی غمگین ہوں لیکن
خلاشتا ہوں میں کوئی دل کا فقیر انساں
(جلیل عالی)

دل میں تھا جو بھی ، لکھ دیا سب کچھ
میں نے جب عین شین قاف لکھا
(نسیم سحر)

اگرچہ مانتے ہیں سب گلوبل گاؤں دنیا کو
مگر نقشے سے اب بھی چار دیواری نہیں نکلی
(انعام الحق جاوید)

کسے نام آوری کا دعویٰ ہو سکتا ہے دنیا میں
پڑے ہیں بے نشاں کتنے یہاں نام و نشاں والے
(خاور اعجاز)

دیکھتے اور دکھاتے ہیں سخن ور لیکن
خواب تو خواب ہیں تعبیر غزل میں آئے
(منظور ثاقب)

رنگ لائے گی تو دیکھے گا بہاروں کا غرور
ہم نے پت جھڑ میں جو زخموں کی شجرکاری کی
(راحت سرحدی)

روز اک دکھ سمیٹ لیتی ہوں
مثل زنبیل ہو گئی ہوں میں
(حمیرا راحت)

دل کا آئینہ کسی دور میں دھندلا نہ سکے
وقت کی دھول میں رہ جائیں نہ اٹ کر سوچیں
(سیدہ قاسم جلال)

یہ جو اک لفظ محبت ہے لغت میں لکھا
ہم اسی لفظ کی تفسیر ہوا کرتے ہیں
(شہہ طراز)

اس نئی منزل کی جانب پھر مچل کر چل پڑی
دکھ کی بارش کو بھی لاچاری نہیں ہونے دیا
(رخشندہ نوید)

تیری باتوں میں اگر ہو گی وفا کی چاشنی
تیرا ہر اک لفظ پھر تو دل نشیں ہو جائے گا
(اقبال سروبہ)

مجھے بھی لوٹ ہی اب جانا چاہیے عادل
پرندے اڑ گئے سب اپنے آشیاں کی طرف
(عزیز عادل)

ہمیشہ کی طرح یہ شاعری باقی رہے گی
مرے شعروں میں تیری روشنی باقی رہے گی
(وسیم عباس)

دل پہ سیدھی جا لگے ایسی زباں درکار ہے
شاعری کا شوق ہے لطف بیاں درکار ہے
(شہزاد احمد شیخ)

نیل کے نام لکھے خط کی حقیقت کو سمجھ
ایک طاقت تھی یقیں کی بھی تو تحریر کے ساتھ
(اکرم ناصر)

میں نے اڑا دیے تھے پرندے خیال کے
لیکن درخت کی وہ نشانی سے آگے
(امجد بابر)

یہ آفتاب ابھی خود ہی زیرِ گردش ہے
کسی ستارے کا پابند ہو نہیں سکتا
(آفتاب خان)

ماہ صیام میں بھی نہ آیا وہ نیکوکار
اب تو گزر گیا ہے یہ "ماہ شوال" تک
(اسد اعوان)

سو گئے لوگ سارے بستی کے
ایک محفل کہ جاگتی ہے ابھی
(نبیل قیصر)

حسن عسکری کاظمی نے غزل خالد احمد کی نذر اور حامد یزدانی نے غزل نذر نجیب احمد لکھی۔ اختر شمار کا تحریر کردہ تنقیدی خاکہ دراز پلکوں کے سائے سائے صفحہ نمبر 178، ممتاز مفتی پر محمد حنیف، جمشید مسرور کا نیلما درانی کی شاعری اور ادبی خدمات پر معلوماتی خاکہ بحوالہ "بزیر شاخ گل" اور سیدہ آیت گیلانی صاحبہ کا خالد احمد کے نعتیہ مجموعے "تشبیب" کے تناظر میں خاصے دلچسپ ہیں۔ علی حسین عابدی کا جاندار مضمون بعنوان آبروئے ادب...... جناب اقبال راہی بھی نظر نواز ہوا 15 نظموں میں رنگ برنگے موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں۔

صفحہ نمبر 234-244 قارئین کے خطوط کے لیے مختص ہیں۔ 9 خطوط میں اپریل کے شمارے پر قدر دانہ آرا درج ہیں۔ خصوصاً "شہر ادب" لاہور کے شمارے پر اہل قلم کے ذاتی تاثرات شامل ہیں۔ جناب ہارون الرشید، جناب انعام الحسن کاشمیری اور جناب رانا محمد شاہد

صاحبان نے احقر کا اپنے اپنے خط میں تذکرہ کیا۔ یادنگاری کے لیے ممنون ہوں۔
امید واثق ہے ماہنامہ 'بیاض' کی متحرک و فعال انتظامیہ نجیب احمد (مرحوم) کی خدمات کے پیش نظر خصوصی نمبر کی اشاعت کا اہتمام کرے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ
خالدہ احمد کا دعائیہ شعر اہل وطن کے نام! عید الفطر مبارک!!

تو ہی حافظ ہے میرے بچوں کا
میرے شہروں کا میرے قصبوں کا

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب! بہت احترام اور مسنون سلام!
'بیاض' کا شمارہ بابت مئی 2021 باصرہ نواز ہوا۔ جذبات تشکر قبول فرمایئے۔
اس مرتبہ رفتگاں کے گوشے میں موجود مضامین دل کو چھو لینے والے تھے۔ نجیب احمد بھی عقبیٰ کی منزل کو سدھارے۔ نجیب احمد سے میری ایک ہی ملاقات ہے، جب وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے واہ تشریف لائے تھے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ شاید بیس برس تو ہو گئے ہوں گے۔ یہاں ادب سے وابستہ احباب ان کے شاعرانہ مرتبہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ افسوس کہ وہ احباب بھی اب نجیب احمد کے ساتھ ہی جنت مکانی ہو گئے۔ ڈاکٹر رؤف امیر، حسن ناصر، اطہر نقوی وغیرہ کی محافل میں نجیب احمد کا ذکر رہا کرتا تھا۔ گل من علیخانی کے مصداق ہر بڑی روح کو بہر حال دنیا سے جانا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن ہے۔ زندگی کے جھمیلے جانے والوں کی یادوں کو دھیرے دھیرے دھندلا دیتے ہیں انہی کے نقوش دیر قائم رہتے ہیں جو باقی رہ جانے والا کام کر جاتے ہیں۔ نجیب احمد کے شعری اعمال میں ایسے اشعار موجود ہیں جو ان کا یاد دلاتے رہیں گے۔ تمام رفتگان کے لیے دعائے مغفرت۔
سلیمان عبداللہ ڈار صاحب کا مضمون "حاصل اور محرومی" نہایت فکر انگیز مضمون تھا۔ میری دانست میں حاصل اور محرومی کا مسئلہ ہمیشہ غیر مساویانہ طبقاتی معاشرے میں پیدا ہوتا ہے۔ صبر و قناعت ایک رویے کا نام ہے مگر طبقاتی معاشرہ انسان کے اس اعلیٰ وصف کو ضائع کر دیتا ہے۔ کسی گھر میں انگوروں کے گچھے کے سچے ترین اور کسی کو ایک دانہ بھی میسر نہ ہو، کسی کو چھینک آنے پر معالجوں کی دوڑ لگ جائے اور کوئی سرطان جیسے موذی مرض میں سسک سسک کر مر جائے اور اس کو علاج کی سہولت نہ ملے تو ایسے میں محرومی ایک لعنت بن جاتی ہے اور قناعت کرنے کا فلسفہ دم توڑ دیتا ہے۔ ایسے میں صبر چیخ میں بدل جاتا ہے، جو اللہ کرے اس پر راضی رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم استحصالی نظام کو بھی اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیں اور اپنے بنیادی حقوق سے بھی دستبردار ہو جائیں۔ ہمارا مذہب اسلام اطبقاتی معاشرے کے قیام کا داعی ہے۔ جس میں تمام افراد کی ضروریات پوری ہو رہی ہوں۔ پیغمبر اسلام نے کوئی غلام اس لیے نہیں رکھا کہ وہ غلام داری معاشرے، کنیزوں اور لونڈیوں والے معاشرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنی بیٹی فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو اس لیے کوئی خدمت گار لونڈی نہیں دی کہ وہ ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے کہ نوکر چاکروں کی فوج رکھنا اسلامی معاشرے کو زیبا نہیں ہے۔ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالو۔ یورپ میں اگر ایک افسر اپنے لیے خود چائے یا کافی بناتا ہے تو یہ عین اسلامی رویہ ہے۔ جب کہ مسلمان افسران کا رویہ سب کو معلوم ہے۔ جہاں تک پریشانیوں اور دکھوں کی بات ہے جو مضمون نگار نے ابتدائی سطور میں بیان کی تو اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ مہاتما بدھ نے کہا تھا۔ ہر دم دکھم دکھم۔
بیماری، حادثے یہ نہیں دیکھتے کہ کون اعلیٰ درجے کا افسر ہے اور کون معمولی اہل کار۔ پریشانیاں اور مسائل تو ہر بڑی روح کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی کو ان مسائل سے نمٹنے کی سہولیات میسر ہوتی ہیں اور کسی کو نہیں ہوتیں۔ اس لیے محروم اور نادار طبقے

کے دکھ اور پریشانیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ کیا نادار طبقے کو اس بات پر غور نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی پریشانیاں اور دکھ زیادہ کیوں ہیں۔
افسانے بھی اچھے تھے اور شاعری کا گوشہ تو یوں بھی غالب ادبی رجحان کی وجہ سے سب سے پہلے مطالعہ میں آتا ہے غزلیات اور مکتوبات میں بھی آصف ثاقب صاحب کو دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔ جب میں ایبٹ آباد میں تعینات تھا تو ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اب تو انھیں دیکھے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ خط کی وساطت سے ان تک میرا سلام پہنچے۔
احباب بیاض کی خدمت میں سلام۔

محمد انیس انصاری

معظمی عمران منظور نعمان منظور و جملہ اراکین ادارتی بورڈ ماہنامہ بیاض، لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے، آپ سب مع الخیر ہوں گے

نجیب احمد بھی چلے، ایک اور سورج غروب ہو گیا۔ میرا ایک شعر ان کے نام:

کس کا سورج غروب ہو رہا ہے
آسماں چپکے چپکے رو رہا ہے

کیا زندگی ہے؟ لوگ دیکھتے دیکھتے خبر بن جاتے ہیں اور آنکھیں اندھیروں میں انھیں جگنوؤں کی طرح ڈھونڈنے لگ جاتی ہیں۔ وہ یادوں کے دھندلکوں سے چھب دکھاتے ہیں، گم ہو جاتے ہیں۔ نجیب احمد نے پوری زندگی ادب کو دے دی۔ 'بیاض' ان کی سانس سانس کی داستان ہے۔ خالد احمد سے محبت کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے جشنِ بہاراں جھنگ کے مشاعرے میں انھیں پہلی بار دیکھا اور سنا۔ وہ دو دوستوں کی کہکشاں کا حصہ تھے۔

خالد احمد، عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، قائم نقوی اور حضرت احمد ندیم قاسمی، سے سفاری سوٹ میں ان کی جوانی اور جولانی عروج پر تھی۔ اس کے بعد بھی متعدد بار وہ ضلع کونسل کے سالانہ مشاعرہ میں جھنگ تشریف لاتے رہے۔ آخری بار وہ یہاں خالد احمد کے پہلے نعتیہ مجموعہ کلام "تشبیب" کی تقریب رونمائی کے لیے آئے۔ اس بار بھی پورا قافلہ ان کے ہم رکاب تھا۔ حلقہ ارباب غالب جھنگ کے زیر اہتمام "جناح ہال" کی یہ تقریب ایک منفرد اور یادگار تقریب تھی۔ پھر ایک طویل عرصہ بعد لاہور میں 'بیاض' کی ایوارڈز کی تقریب میں انھیں دیکھا۔ شباب رخصت ہو چکا تھا۔ وقار و تمکنت غالب آ چکی تھی۔

شاعری میں نجیب احمد، خالد سکول آف تھاٹ کے نمائندہ تھے۔ جدید لب ولہجہ اور سلیقۂ اظہار ان کے ڈکشن کا امتیازی وصف تھا۔ انھوں نے بھرپور شاعری کی اور باکمال شاعری کی۔ اچھا شاعر وہی ہے جس کا کوئی شعر، کوئی لفظ، کوئی حرف، حرف رایگاں نہ ہو۔ نجیب احمد کے ہاں 'بھرتی' کے شعر کی تلاش بسیار ہے۔

تازہ شمارے کے حلقۂ ادارت میں پہلی بار ان کا نام نہ پا کر صدمہ ہوا۔ آپ سب کے دکھ اور غم کا اندازہ ہر اہل قلم کو ہے۔ بایں ہمہ مشیت ایزدی کے فیصلوں سے انحراف ممکن نہیں۔ آئیے دعا کریں اللہ تعالیٰ نجیب احمد کا سفر آخرت آسان بنائے اس کی مغفرت فرمائے اور آپ سب کو اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

اپنی کتابوں کے اوراق میں زندہ رہتے ہیں
اہل قلم دائم آفاق میں زندہ رہتے ہیں

رہے نام اللہ کا.........

سوگوار

حسن عسکری کاظمی
آثارِ ہنر

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی
مودۃ فی القربیٰ
زاہد شمسی
Yasmin

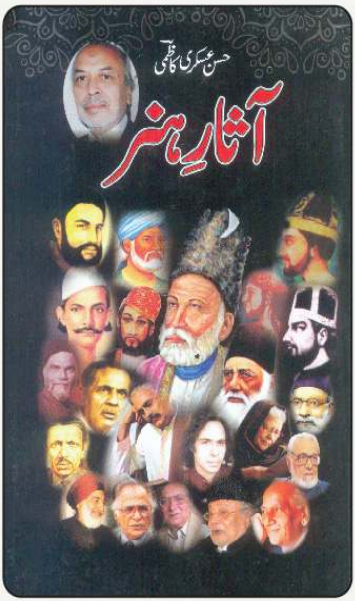

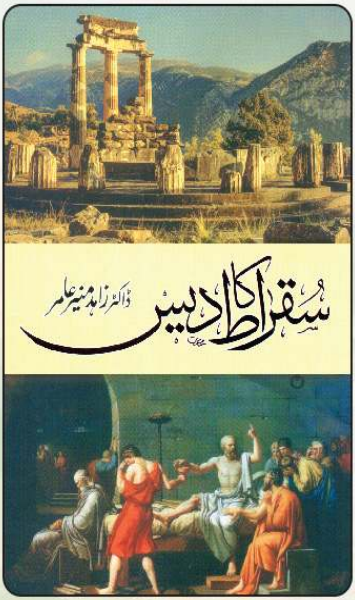

اکرام الحق سرشار
صبح ہونے دو

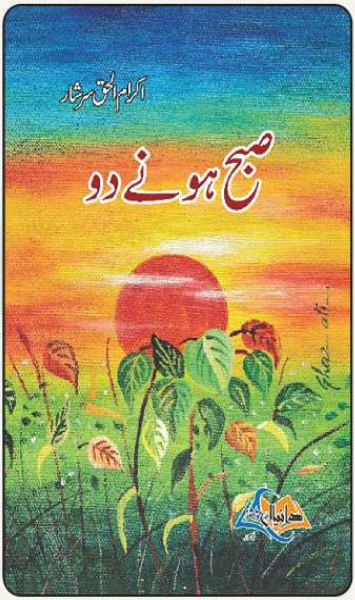

سقراط کا دیس
ڈاکٹر زاہد منیر عامر

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888